

”واہ اماں“ ارجمند نے کہا ”معمولی کھانی سے اپن گھبرا نے والے نہیں اور پھر ماں تیرے بیٹھے ہیں۔ ہم بڑی بڑی تکلیفیں ہمارا کچھ بگاڑنہ سکیں یہ تو معمولی کھانی ہے۔ تم خواہ مخواہ گھبرا تی ہو۔“

”گھبرا تی نہیں میں،“ بان بوٹی ”مجھے معلوم ہے میں جانتی ہوں میں سب جانتی ہوں مجھے نظر آ رہا ہے،“ یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارجمند نے بڑھ کر اس کو آنکھیں میں لے لیا اور یوں تھکنے اور پیار کرنے لگا جیسے وہ چھوٹی سی پچی

”دیکھو ماں میں ترقی کرنے کرتے پڑتے ہے کیا بنوں گا۔ فیکری کامیاب بنوں گا“
معلوم ہے اس کی تفخواہ کیا ہوتی ہے دیکھ بزار یعنی پندرہ سو اعتبار نہ ہو تو یہ دیکھ لومیر
اپا تھا، اس نے اپنا دایاں ہاتھ زبردستی ماں کے ہاتھ میں دے دیا ”یہ دیکھو یہ لکیر عمر کی
لکیر ہے یہ اور کرو حساب یہاں تک ہونے چالیس برس یہاں پچھن ختم ہونے اور یہ
اسی سے اوپر کا حصہ ہے پتھ نہیں نوے تک جیویں یا سو اسو تک۔ اور یہ دیکھو یہ ستارہ
جو بنتا ہے نا یہ والا اس کا مطلب ہے بڑا عہدہ بہت بڑا عہدہ یعنی فیکری کامیاب اور سمجھ
لو پچاس کے لگ بھگ ملے گا۔ یہ عہدہ اور تم ماں تم ابھی سے اپن کے ٹین پاٹ کافلر
کر رہی ہو۔ بھئی حد ہو گئی“

ماں سے جدا ہو کر اس نے ماتھے سے پسینہ پوچھا اور حسرت زدہ نگاہ سے گلی کی طرف دیکھا۔ پھر ایلیٰ کی طرف دیکھا۔ یوں چونکا جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکا ہو۔ کہنے لگا ”یار کیا کروں اپن تو مر نے ورنے سے ڈرتے نہیں۔ بھی آخر کیا ہو گا وہ کہا ہے نا استاد نے۔ پلا و کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اور جہاں تک اپن کا خیال ہے اماں یہاں سے اڑایاں وہاں جا بیٹھا۔ یہاں کپ کیپ ہیں اور گکوری، ڈکوری ہیں اور وہاں حوریں ہو گی یہاں انگرایندی پر محنت کرنی پڑی ہے وہاں محنت کے بغیر سب ملتا ہے۔ اپن کے ایسے نصیب کہاں کہاں بھی سے حوروں کی

دنیا کا پاسپورٹ مل جائے۔ اپن کہاں مرتے ہیں میاں مگر اماں کو جواپن کی موت کا فکر لگا ہے کہیں اس غم سے نہ مر جائیں ہم و یے کھانی تو اپن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن یار، وہ کچھو قتفے کے بعد بولا، ”ایک بات کا فسوس رہ جائے گا۔“

”مال رہ جائے گا“ تم نے وہاں فیکٹری میں آکر پیش شہنشاہی نہ دیکھی۔ گاؤں کی گوریاں جب ہاتھ جوڑ کر اپنے حضور میں گورنیش بجالانے کے لیے آتی ہیں مکھی اڑانے کے بھانے سلاتی ہوتے ہیں لکھڑاٹھانے کے بھانے گورنیش بجالانی جاتی ہیں ہے کھیل کے بھانے چھیلیں پیش کی جاتی ہیں اور مابدولت ملاحظہ فرماتے ہے اور وھنبار دیتے ہیں لیکن کیا فائدہ؟، ان نے آہ بھری ”تم نے اگر یہ نظرے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھو بے کار ہے بس یہی ایک مال لے جاؤں گا“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”مال لے جاؤں گا کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا
ارحمد نے دفعتاً پینٹر ابدلے صاف تو ہے ”وہ بولا“ مابدولت اس وقت جا رہے ہیں۔ اور یہ مال لیے جا رہے ہیں۔ مگر یا تم کیسے آسکتے ہو وہاں تم تو خود مصروف ہو۔ پر دوست کیا ہاتھ مارا ہے۔ واہ واہ کیا چیز پائی ہے تم نے۔ آخر ہمارے شاگرد ہو ناپیٹا ف کیا چیز ہے کیا چال ہے کیا انداز ہے کیا بات ہے۔ جواب نہیں بڑے بڑے کھلاڑیوں کے دانت کھٹے کر دیئے تم نے آخر اپن کے بالک ہونا

”لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ایلی نے تجھاں عارفانہ سے پوچھا
”ہم کچھ نہیں کہہ رہے بیٹا“ اس نے اپنے انداز میں کہا ”ہم تمہیں وھنبا دے رہے ہیں تم نے اپنے گرو کی لاج رکھ لی۔ مگر پتھر صرف ایک بات کا کھلاڑی ہے۔ ستاروں سے کھیلو گے تو کھلاڑی رہو گے اور اگر سورج کو پا لینے کی کوشش کرو گے تو پر جل جائیں گے اور پھر اڑنے کی شکنی نہ رہے گی۔ اپنے گرو کے اس قول کو یاد

رکھو۔ پتھر کھلاڑی بنو۔ پروانہ نہیں اپنے پرنہ جلاو۔“

ورنہ کیا

ارجنند کو یکے میں بٹھانے کے بعد ایلی مسوچنے لگا اب کیا کروں کہاں جاؤں اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ شریف اور شہزادی کی طرف جائے فرحت کے پاس جانا بھی اسے پسند نہ تھا۔ فرحت کی محبت بھری باتوں میں طنز کا عصر شامل ہوتا تھا اور وہ بات بات پر شہزاد کا طمع دیتی تھی۔ رضا یا صدر کے پاس جانا بے کار تھا۔ وہ بھی گفتگو کی ابتداء شہزاد سے ہی کرتے تھے جب وہ واپس آ رہا تھا تو راستے میں اسے رضاملا۔

”ایلی،“ رضا نے اسے ملکارا ”ویکھ میری طرف، جب تک میرا دم میں دم ہے تو چاہے کسی سے محبت لگا اور اگر کوئی تیری طرف ظریف ہر کردیکھ لے تو بس مجھے بتاوینا سمجھے وہ پاگل لمبا وہی تیرا دوست مجھے ابھی یکے میں بھایا ہے اگر اس نے کوئی گڑبوٹ کی تو اس باکی سے اس کی کھوپڑی توڑوں گا“ اس نے اپنی لنگڑی نانگ کو یوں چلایا جیسے وہ ہاکی سٹک ہو۔ سمجھے لیکن یاڑ وہ اس کے قریب ہو کر بولا ”ایک بارہمارے سامنے تسلیم تو کر لے کتو اسے پیار کرتا ہے۔ بڑی اوپنجی جگہ ہاتھ ماہی۔ دوست اپنے کتو ان باتوں میں دچپی نہیں مگر تو نے تو بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے خدا کی قسم جی چاہتا ہے تجھے جہنڈا ابنا کر لہرا تا پھروں۔ ہاں تو پھر کیسے رام کر لیا تو نے اسے اور صرف اسے ہی نہیں ساتھ ہی اس کے مالک کو بھی پچھاڑ دیا ہے سالہ بول نہیں سکتا۔ بول بول بول بتادے اچھایا نہیں بتاتا تو نہ کہی،“ رضا نے ایلی کو خاموش کھڑے دیکھ کر کہا ”پھر بھی ہم تیرے ساتھ ہیں ہاں“ یہ کہہ کروہ آگے چل پڑا۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ مڑ کر اس ہاکی والے کو پکڑ لے اور اس کے سامنے روکر سارا حال کہہ سنائے، اس کا جی چاہتا تھا کہ دل کی بات چیخ چیخ کر لوگوں کو سنائے اور اس طرح دل کا بوجھ بلکا کر لے۔ مگر جب بھی وہ بات کہہ دینے کا ارادہ کرتا تو چھن سے شہزاد اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی دونا دسی آنکھیں ڈولتیں اس کے ہونٹ عجیب سا

خم کھا کر کچھ کہتے اور وہ مسکراتی۔ نہیں نہیں ایلی چلاتا۔“ میں کسی سے نہیں کہوں گا میں تم سے بے وقاری نہ کروں گا میں تمہارا راز فاش نہیں کروں گا، اور ایلی کے دل کا بوجھا اور بھی بڑھ جاتا۔

”ایک نا ایک روز تم ضرور بتاؤ گے، شہزاد آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی۔“ تم اپنے دستوں سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ اچھا تمہاری خوشی۔ میری بدنا میں میں ہی تم خوش ہو تو ایسا ہی تھی، شہزاد کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ بھاگتا اس ہا کی والے سے دو رباز اڑوالوں سے دور اور دور کہیں وہ کسی پر سے کہہ نہ دے کہیں اس کے دل کی بات زبان پر نہ آجائی۔

جب وہ شہزاد کے پاس چیخاتو وہ مسکرا رہی تھی اسی طرح جس طرح بازار میں وہ چمن سے اس کے سامنے آ کر مسکرا نے لگی تھی۔ وہ کہاں ہے؟“ ایلی نے پوچھا شہزاد نے منہ بنایا اور اپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”کہاں بھاگ گئے تھے تم،“ وہ بولی ”کہاں جاؤں گا جا سکتا ہوں کیا؟“

وہ ازسر نو مسکرانے لگی ”بھاگ جاؤ،“ وہ ہستے ہوئے چلائی ”دور بہت دور ورنہ“ ”ورنہ کیا؟“ ایلی نے پوچھا

”ورنہ،“ شہزاد نے اپنے سڈوں بازو اس کی طرف بڑھا کر اسے قھام لیا ”ورنہ تم پکڑے جاؤ گے قید کر لیے جاؤ گے،“ اس کے بال اڑ کر ایلی کے منہ پر آپڑے دم رک گیا ”بس،“ وہ تالی پیٹ کر بولی ”بات کرنے سے بھی گئے بولو بولنے نہیں،“ ایلی کی آنکھیں گویا ایلنے لگیں اس نے شہزاد کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا مگر وہ بازو چھڑا کر بھاگ گئی ”اونہوں،“ وہ اسے دیوانہ وار پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر بولی ”وہ اوپر ہیں اگر،“ پھرگ پر کھڑی ہو کر رابعہ سے با تینیں کرنے میں یوں مشغول ہو گئی جیسے آن کی آن میں ایلی کے وجود کو قطعی طور پر بھول چکی ہو جیسے احساس ہی نہ ہو کہ قریب ہی ایلی انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہے۔ آنکھیں سرخی ہو کر ایلی جا رہی

ابھی وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ شریف کے پاس جائے یا نہ جائے۔ کہ محلے کی ایک بوڑھی عورت نیچے شور مچاتی ہوئی بولی

نی یا پرانی

”اے ہے باجرہ کہاں گئی میں کہتی ہوں رابعہ شہزادم کہاں ہوں“، دفعہ ۳۶ گے اس کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر چلانے لگی۔ اے تو یہاں کھڑا ہے ایلیڑ کے جا جا کر اپنے باپ کو لاتا تو اسے سٹیشن پر ملنے نہیں گیا۔ سنایا ہے علی احمد آرہا ہے، ”ایلی اس کی بات سن کر بھونچ کارہ گیا۔ نہ جانتے وہ بڑھیا کیا کہہ رہی تھی شاید وہ علی احمد کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔“

”میں نے کہاں بات تو سن“ وہ شور مچاتا ہوا اس کے پیچے بھاگا مگر وہ تو آندھی کی طرح چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ ابھی ابھی سٹیشن سے آیا ہے کہتا ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں اب کی مرتبہ ایک اور ساتھ ہے۔

”کون آیا ہے ماں بر کتے“ جانو کھڑکی سے چلانے لگی

”اے ہے اپنا علی احمد آیا ہے“

”ساتھ کون ہے“ جانو نے پوچھا

”کہتے ہیں اب کی بار کوئی نئی نو میں ساتھ ہے“ بر کتے نے شور مچایا

”اے بہن“ مالی حاجاں دوڑی دوڑی چھتی گلی سے باہر نکلی اس کے ساتھ تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہوتی ہے بہن۔ نئی ہو یا پرانی تمیز نہیں بس ساتھ ہو

”ہوں نئی“ بی بی فاطمہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی ”نہ جانے کہاں سے گلی سڑی ہوئی اٹھالا یا ہے۔ اسے آج تک مالم نہیں ہوا کئی کیا ہوتی ہے اور پرنا ی کیا“

”اے ہے اپنی طرف سے تو نئی ہی لاتا ہے۔ پر کیا کرے نصیب ہی میں پرانی لکھی ہیں“ مالی حاجاں بولی

”پر بہن“ برکتے نے کہا ”حمد و کہتا ہے اب کے تعداد ہی کردی علی احمد نے“

”کیا کیا ماں برکتے بات بھی تو کرنا ماں وہ تو ہر مرتبہ ہی حد کرتا ہے“ چاروں طرف شور مج گیا۔

”پر لڑکی کیا بتاؤں میں“ ماں برکتے نے ہاتھ مل کر کہا ”اب کی مرتبہ جسے لایا ہے اس کی گود میں بچے ہے ہاں بچے لوکرلو بات“

”ہائیں بچے کیا کہا ماں بچے گود میں ہے“ چاروں طرف سے قلبے بلند ہوئے۔

”چلو یہ بھی چھا ہوا۔ آج تک بچے والی نہ جانی تھی“

”ابھی تو دیکھو ہم وہ کشمیر کا سبب ایک سال تک نہ پھل سکا تو یہ بیچاری کب تک چلے گی۔“

”میں نے کہا ماں برکتے“ شہزادھرگی میں آکر چیخنے لگی ”کیا واقعی بچے والی لایا ہے علی احمد یادا ق کر رہی ہو“

”لو میں کاے تم سے مجاک کروں گی“ ماں برکتے بولی ”اسے ہے حمادتے بتایا ہے“

”اے لو“ بی بی نتھو بولی ”قافلہ تو آبھی پہنچا“ اس نے کچی حومی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

لے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے لڑکی ماں حاجاں شہزادے سے کہنے لگی ”سانچ کو کیا آنج آبھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا“

حاجاں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ علی احمد سینہتا نے چوگان میں داخل ہو ”علی احمد مبارک ہو“ ایک بولی

”میں نے کہا باقی قافلہ کہاں ہے تیرا“

”اے چٹی پر آیا ہے کیا۔ اچھا کیا جو آگیا تیرے بغیر یہاں رونقیں نہیں ہوتی“

”اے علی احمد اب کی بار نہا ہے نہیں لایا ہے تو“

علی احمد چوگان میں ہیر و کی طرح کھڑے مسکرا رہے تھے جیسے ہیر ون کو دیو کے چنگل سے چھڑا کر لائے ہوں۔

”لو ماں“ وہ بولے ”کون کہتا ہے نئی ہے ماں ہم تو پرانی کے پچاری ہیں وہ کہتے ہیں نانی نوون پرانی سودن اور اگر اکیلا ہنا تو سو اگت کے لئے تم سب یہاں نہ ہوئیں۔ کسی کو پختہ بھی نہ چلا کہ میں آیا ہوں“

”اے بڑے کے“ حاجاں مالی بولی ”تو کیا ہمیں پختہ دینے کے لئے لاتا ہے تو“
”اور تو کیا پنے لئے لاتا ہوں“ وہ تھقہہ مار کر بولے ”تم بھی کتنی بھولی ہو بی بی نخو۔ اپنا شوق تو مدت سے ختم ہو چکا ہے تو محلے کی نفری بڑھانے کے لئے لے آتا ہوں“

”جبھی اب کے بچے والی لایا ہے“ جاؤ کھڑکی سے چیخنے لگی
”اور کیا جاؤ“ علی احمد بنے ”تو تو آپ سیاںی ہے“
پر علی احمد ”مالی حاجاں کہنے لگی“ ”جتھے کوئی بڑی کی نہیں ملتی کیا“
”بڑی کی“ علی احمد بنے ”بڑی کو کیا کرنا ہے مالی حاجاں کام کی وہ ہوتی ہے جو تحریک کار ہو“

”پر علی احمد“ نخوبی بی بی نے ہستے ہوئے کہا ”کام کی تو تو لایا نہیں کبھی کباڑ خانہ ہی اکٹھا کر رکھا ہے۔ لے ماں بر کتے ایمان سے کہنا و یکھنے میں ہے کوئی کام کی۔“
”لوسن لو بی بی کی بات“ علی احمد بنے ”میں کیا و یکھنے کے لئے لاتا ہوں بی بی میں کیا بچہ ہوں کہ دیکھ کر رنجھو جاؤں وہ دون گئے بی بی۔ اور ہاتھی دانت لانے کافا مدد تھہاری آنکھیں چکا چوند ہو جائیں تو اپنا کیا فا نمہ ہوا اس میں کیوں بی بی“ وہ چوگان میں کھڑے ہو کر ہیر و کی طرح ہٹنے لگے۔

”ہائے علی احمد“ ایک نے ہٹنٹوں پر انگلی رکھ رکھ کر کہا
”تو بہے علی احمد“ دوسرا ہستے ہوئے چلائی

”کچھ شرم کیا کر بات کرتے ہوئے“ تیسری قہقہہ مار کر بولی چوگان ان کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اور علی احمد فاتح کی حیثیت سے گھر کی طرف چل پڑے جیسے سچ پر ایک خوبصورت جملہ کہہ کر ایکٹر بابر نکل جاتا ہے اور تماشائی تالیاں پیٹتے رہ جاتے ہیں۔

علی احمد کے پیچے پیچھے وہی پرانی راجونیاں رکھ لئے آ رہی تھیں اور دو میں دوسال کا بچہ تھا اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے مشکل سے اپنے آپ کو گھیٹ رہی ہو۔
”اے ہے، ماں برکتے ہوں!“ ہم سے بھی پردہ ہے کیا لڑکی بر قلعہ اٹھا لے
”ماں ہمیں سے اوپر وہ نہیں،“ تھوپی بیٹی کہا، ”یہ نیا زمانہ ہے اپنوں سے پردہ غیروں سے تم جانتی ہیں ہمیں“
جانو بولی ”اے بی بی ڈرتی ہے کہیں لفڑن لگ جائے ہماری“
اس کے پیچے پیچھے تا نگے والے کے ہاتھ میں سامان تھا اور آخر میں شیم ایک لڑکی اٹھائے اور دوسری کو انگلی لگائے آ رہی تھی۔

شیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بھوٹیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھ کا فرق بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے محلے والیوں کو دیکھتے ہی پینٹنا شروع کر دیا۔

”اے ماں برکتے دیکھ لے میرے تو نصیب ہی بچوٹ گئے۔ میری طرف کیا دیکھ رہی ہو میں تو دلالہ بن کر رہ گئی ہوں اپنے ہی گھر میں۔“

”اے تم کیوں دلالہ بنو،“ تم تو اللہ کے فضل و کرم سے سہروں سے بیا ہی ہو اور ان فصلی بیوروں کا کیا ہے یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں

”نه ماں یہ نہ کہواں کھیت میں تو خالی فصلی بیوروے ہی پلتے ہیں،“ شیم بولی ”یہاں تو آنے جانے والیاں ہی چلتی ہیں۔ تم اس گھر کو کیا جاؤ؟“

”غم نہ کرو،“ بی بی تھوپ نے کہا ”یہ دور بھی گزر جائے گا“

”یہ چاہے گزر جائے اپنا دو رہیں آئے گا یہاں ہاں،“ وہ بولی ”لکھ لومیری بات

یہاں تو سوکنیں ہی آئیں گی اپنے نصیب میں سکھنیں،“

”اب تو ایلی پر بھی سوکن آگئی، شہزادا پنی کھڑکی سے چلائی
اے ہے ایلی پر کیوں سوکن آئے لگی ماں برکتے نے کہا

”اب تو ایک نہماں ایلی بھی آگئی، وہ بھی

”لویہ بھی کوئی بات ہے،“ بی بی نہ تھو نے کہا ”نہ بہن، ایلی ایلی ہی ہے۔ جو مرتبہ ایلی
کا ہے وہ کسی اور کانٹیں ہو سکتا میں تو کچھ کہوں گی“

”نہ جانے ایلی جوان ہو کر کیا ملک مخلائے گا“ برکتے نے کہا

”آخر بیٹا کس کا ہے،“ حاجاں بولی

”وہ کہتے ہیں نا،“ نہ تھو چلائی ”ہونہا رہرو والے چکنے پختے پات ابھی توڑ کے نے
ابتداء ہی کی ہے کیوں شہزادہ ٹھیک کہتی ہوں نا میں“ نہ تھو نے اسے طعنہ دیا

”تو جو کہتی ہے بی بی تو ٹھیک ہی کہتی ہوگی،“ شہزادا بولی ”تجھ سے بڑھ کر تجربہ کے
ہے ان باتوں کا“

یہ سن کر چوگان میں قہقہہ گونجا ”تو ناس سے نپٹ سکے گی“ ماں حاجاں نے کہا
ماں برکتے کہنے لگی ”نہ مائی اس سے کون نپٹے ایسی تجھ کہ پیچی کی طرح چلتی ہے۔“

”پر ماں“ ایک نے مدھم آواز سے سرگوشی کی ”بری نہیں محبت میں ملتی ہے کھاتر تو
اجو کرتی ہے۔ بیچاری بڑی اچھی ہے۔ بس صرف یہی اللہ مارا اک شوق ہے“

ماں حاجاں قریب تر ہو گئی ”ہو گاشاید تم ٹھیک کہتی ہو لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ محلے
والے بھی تو جینے نہیں دیتے“

”اے ہے،“ بی بی نے کہا ”مجھے کیوں دیتے ہیں جینے“

”تو اپنی بات چھوڑ، بی بی نہ تھو“ اور وہ ایک دوسرا کے قریب تر ہو گئیں۔

ہے ہمت

محلے والیوں کی باتیں سن کر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ شہزادے کے خلاف بات کرنے

سے بھی نہ چوکتی تھیں حالانکہ شہزاد کے تعلقات محلے والیوں سے بے حد اچھے تھے۔ وہ ان کی عزت کیا کرتی تھی اور ان سب کی حد سے زیادہ خاطر و مدارت کیا کرتی۔ کسی نہ کسی بہانے وہ انہیں گھر بلا لیتی۔ جھوٹ موت مشورہ لینے کے لئے یا کوئی دوا دار و پوچھنے کے لئے یا کوئی اور بات نہ سمجھتی تو کہتی ”ماں چل تو ذرا مجھے بتا کہ میٹھی سویاں کیسے پکاتے ہیں۔ ہائے مجھ سے تو ہر بار خراب ہو جاتی ہیں اصل میں مجھے یہ نہیں معلوم کہ میٹھا کتنا ہونا چاہئے اور سویاں کتنی“ گھر لے جا کروہ جانو سے کہتی ”لے جانو ذرا لا تو ایک پلیٹ ماں کے لئے“ اور پھر ماں سے مخاطب ہو کر کہتی ”دیکھ تو کھا کے اسے تا کہ معلوم ہو کیا غرامی ہے نہ جانتے کیا نقش رہ جاتا ہے۔“

حالانکہ شہزاد پکانے میں بے حد باہر تھی اور پکانے کے معاملے میں محلے والیاں تو بالکل جاہل تھیں۔ جب میاں ہی کھانے کے شوپین نہ ہوں تو بیویاں بھلا کیسے اچھا پکا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شہزاد نے کبھی اپنی چیز کی تعریف نہ کی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ شہزاد کی بڑھتی ہوئی بدنامی کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس کے شہزاد کے ہاں رہنے کی وجہ سے سب اس سے بدظن ہو چکے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزاد کا رنگ انوکھا تھا۔ اس میں عجیب سا بانگپن تھا ایک شوہنی تھی رنگیں تھیں اس لئے وہ محلے میں آتے ہی محلے والیوں کی نگاہ پر چڑھنی تھی لیکن اس کی اس خصوصیت نے بدظنی کی فضاضیدا کی تھی۔ بدنامی کی نہیں اور اب ایلی کی وجہ سے وہ بدنام ہوئی جا رہی تھی۔

اس خیال سے ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مجرم ہے۔ اور اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے کے لئے چپ چاپ اوپر چو بارے کی طرف چل پڑا۔

”آگئے تم“ شریف اس کی طرف دیکھ کر بولا ”ہم تو کب سے انتظار کر رہے تھے“ نیچے کھڑا علی احمد کو کوئی نہیں پوچھتا محلے میں یہ جتنے جلوس چاہے نکالے جسے چاہے لے آئے جائز ہو یا ناجائز شریف نے آہ بھری ”ہمیں تو ظالموں نے کچھ بھی نہ

کرنے دیا۔“

”جس میں جرأت ہوا سے کوئی نہیں پوچھتا،“ شہزاد بولی اور اس نے ایک جرات مندانہ نگاہ ایلی پر ڈالی ”کیوں ایلی،“ وہ بولی ”ٹھیک ہے نا۔“

”مجھے کیا معلوم،“ ایلی نے جواب دیا تو پھر تمہارا حشر بھی ایسے ہی ہو گا جیسا ان کا ہوا ہے شہزاد نے شریف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔“

”صح کہتی ہوتی،“ شریف نے آہ بھری ”در اصل وہی ڈرتتے ہیں جن کی محبت پچی اور پا کیزہ ہو۔“ ہونہہ پچی اور پا کیزہ ”شہزاد نے کہا،“ بڑا ولی کو تھانی کے پردے میں چھپایا نہیں جا سکتا۔

”اب یہی کون ہے، جیسے علی احمد نے تو اپنے گھر کبادی کی دوکان کھولی ہوئی ہے۔ یہی کہاں سے لائے گا۔ وہ کشمیر والی نئی لایا تھا بالکل بے کار پھولی ہوئی روٹی کی طرح دو دن میں پچک کر رہ گئی۔“

”میرے خیال میں،“ ایلی بولا ”وہی راجو ہے دولت پور والی۔ دولت پور میں اسے پناخہ کہتے تھے۔“

”پناخہ،“ شہزاد بھی ”چلا ہوانا،“

”کون ہے وہ،“ شریف نے پوچھا

”نام ہی سے پتہ چل رہا ہے۔ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے کیا،“ شہزاد نے کہا تمہاری نگاہ میں تو کوئی جھتی ہی نہیں شریف مسکرا کر بولا ”سوائے اپنے،“ اس نے اپنی نگاہیں جو نک کی طرح شہزاد پر گاڑ دیں۔

”جھوٹ ہے کیا،“ وہ قہقہہ مار کر بولی ”میری برادری کون کر سکتا ہے۔ اور پھر اس محلے میں جہاں سب کاٹھ کباد بھرا ہے۔ کیوں ایلی کیا یہ جھوٹ ہے،“ وہ ایلی کی طرف

دیکھ کر شرارت سے مسکراتی۔

کھانا کھا کر ایلی علی احمد سے ملنے کے بہانے وہاں سے چلا آیا۔ نہ جانے کیوں شریف کی موجودگی میں وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ حالانکہ شریف کی موجودگی میں شہزاد کا اتفاق نہیں ہوا، وہ بات پر کوئی نہ کوئی اشارہ کرتی۔ کبھی ہاتھ پڑھا دیتی جیسے کہہ رہی ہوا اگر ہمت ہے تو پکڑ لو۔ کبھی اپنا باوری پاؤں ننگا کر کے دکھاتی اور کبھی یون بارزو پھیلا دیتی جیسے اسے آغوش میں لینے کے لئے بے تاب ہے۔

شاید انہی اشارات کی وجہ سے اس کے صبر کا پیانہ چھلک جاتا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے جانے پر مجبور ہو جاتا۔ یا شاید اس کی وجہ پر ہو کہ وہ شریف کی موجودگی میں بار بار محسوس کرتا تھا کہ وہ مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے اور احساس جرم اس قدر شدید ہو جاتا تھا کہ اس کے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔

اجلے کی راجپوتی

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد قہقہہ پر قہقہہ لگا رہے تھے ”دیکھو نا سیدہ“ وہ کہہ رہے تھے ”پہلے بھی آئی تھی راجو پر پہلے تو وہ شیم کی مہماں تھی نا پرانی سہیلیاں ہیں یہ دونوں“

”ہونہہ“ شیم چلائی ”جان نہ پہچان خالہ جی سلام“

علی احمد نے شیم کی بات گویا سنی ہی نہیں ”اورا ب اب تو بہنیں بن گئی ہیں“

”اوٹہہ بہن“ شیم چلائی

”تو اس کی باتیں نہ سن“ علی احمد نے نہ کر شیم کی بات کاٹ دی ”ایے مذاق یہ راجو سے کیا ہی کرتی ہے بے تکلفی جو ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں بہنیں بنی ہوئی ہیں تو انہیں اکٹھا ہی کرو سو میں نے راجو سے لکاح پڑھوا لیا۔ پوچھ لو شیم سے غلط بات نہیں کہہ رہا میں“ اور پیشتر اس کے کہ شیم کوئی بات کرے وہ معاً ایلی کی

طرف متوجہ ہو گئے ”ہائیس ایلی تم یہاں“ پھر خود ہی بولے ”اور ٹھیک تو ہے تو تو اب امتحان سے فارغ ہو چکا ہو گا۔ لیکن تم نے اپنی امی کو سلام نہیں کیا۔ تو تو اچھی طرح واقف ہے راجو سے۔ ان کی بڑی دوستی ہے ایک دوسرے سے جب یہ دولت پور میں تھا تو اکثر جایا کرتا تھا راجو کے ہال ”وہ ہنسنے لگے“ راجو سا جو آجوجی سے واقف ہے ایلی حکیم سن کو بھی جانتا ہے کیوں ایلی ”وہ ہنسنے لگے“ اور ایلی تو بہت خوش ہو گا۔ مفت کا ایک بھائی بھی مل گیا۔ تم نے شیر و کونہیں دیکھا ایلی آ۔ مجھے شیر و سے ملائیں۔ لا بھی راجو لانا دلا شیر و کو۔ جاؤ بھی تم دونوں کھلیو چوکان میں لے جائے ایلی سیر کر لاد را۔

All rights reserved
© 2003 by the author
Published by InSight
www.insight-pakistan.com

ایلی کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ حمیدہ رشیدہ کو بدلانے لگے ”لو بھی تم لے جاؤ اسے ایلی تو شر ماتا ہے شر ماتا تو ہوا۔ بھی چھوٹا بچہ اٹھایا بھی ہو۔“

اتھے میں محلہ والیاں اکٹھی ہو گئیں ”کیا لایا ہے اب کی بار و کھاتو“ ایک نے کہا ”اے ہے یہ تو وہی پرانی راجو ہے میں بھی پہلے کشمیر کا سیب لایا تھا اب نہ جانے کہاں کالا یا ہو گا۔“

”سیب ہی تو ہے علی احمد بولے“ وہ کشمیر کا تھا یہ کلوکا ہے۔ وہ دکھانے کا ہوتا ہے، یہ کھانے کا، ذرا ترشی ہوتی ہے اس میں ماں، بلکہ ترشی کی وجہ سے اچھا ہوتا ہے یہ ”میں نے کہا یہ دہن چھپی ہوئی کیوں بیٹھی ہے“ دوسری بولی ”لہنیں چھپی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں بی بی“

”کیا شر ماتی ہے ہم سے“ شہزادو اور اخی ہو کر بولی ”شر ماتی تو ہے“ وہ بولے ”تمہارے مقابلے کی ہوتا میدان میں آئے“ وہ سب ہنسنے لگیں ”اب کربات“ ایک چلائی ”ہم سے ہی باعین کر لیا کرتی ہے تو“ شہزادو ہنسنے لگی ”اس بیچاری کا کیا قصور ہے یہ تو لانے والے کی سو جھو بوجھو ہوتی ہے۔“ ”سنا ہے شہزادو ہ تیرا سو جھو بوجھو والا شریف آیا ہوا ہے۔“

محلے والیوں نے پھر قہقہہ لگایا ”باہر کیوں نہیں لکھتا میدان میں،“ علی احمد نے قہقہہ لگا کر کہا ”لیکن وہ بھی سچا ہے گھر میں دھن دولت کے انبار لگے ہوں تو باہر کافا نہدہ“ یہ کہہ کروہ اندر داخل ہو گئے اور راجو سے ہی ہی کرنے لگے۔

”اے ہے بہن“ تھوپی بی داخل ہوتے ہوئے بولی ”ابھی تک اپنے علی احمد کا چاؤ نہیں اتر کیا جوہر بارشی لے آتا ہے۔“

”اوہہوں نی“ شہیم نے ہونٹ نکالے ”وہی پرانی تو ہے“ ”میں نے کہا تو یہوں قواب کی بارگایا گل کھلایا ہے اپنے علی احمد نے“ تھوپی بی یہ کہتے ہوئے علی احمد کے کمرنے کی طرف بڑھی۔

”اندر کیسے جائے گی بی بی“ شہیم بولی ”اندر تو دونوں میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔“

”ہاہاہا“ علی احمد کی آواز آئی ”ہم سے زور آزمائی کرے گی تو راجپوتی جو ہوئی اجلے کی راجپوتی ہاہاہا لیکن ہم بھی علی پور کے ہیں ہاں“

”تو اندر جا کر کیا کرے گی بی بی تھو“ سیدہ بولی ”تو بھی کیا اجلے کی راجپوتی ہے جو اندر جائے گی۔“

”میں کیوں ہونے لگی اجلے کی راجپوتی“ تھوپی بی جوش میں بولی ”پر میں کیا علی احمد سے ڈرتی ہوں جو یہاں کھڑی رہوں گی“ یہ کہہ کر تھوپی بی شور مچاتی ہوئی اندر داخل ہو گئی ”اے ہے علی احمد یہ کیا دھینگا مشتی شروع کر کھی ہے تو نے“

یہ صورت حالات دیکھ کر ایلی چپکے سے باہر نکل آیا۔ اندر علی احمد قہقہہ لگا رہے تھے ”ہی ہی ہی بی بی تھو تم ہو۔ کہو کیا حال چاں ہے۔ ہاہاہاہا“

بول کیا چاہتا ہے

جب وہ چوگان میں پہنچا تو رضا اللہی شیکتا ہوا چھتی ڈیورڈھی سے لکلا ”کیوں بابو“ وہ بولا ”مفت کا بھائی ہا تھا لگا ہے۔ سیدھے ہا تھے سے کھلا دو مٹھائی ورنہ“

”بکونیں“ ایلی چلایا ”خواہ مخواہ میری بے عزتی کرتے ہو“

”ابھی تو بے عزتی نہیں کی میں نے ابھی تو عزت کر رہا ہوں با بو۔ جب بے عزتی کرنے پر آؤں گا تو رو دو گے تم۔ چلو سید ہے چلو میرے ساتھ۔ ادھر کارخ کیا تو یہ ہا کی سٹک چلاوں گا یا رمیر اچٹ پڑا ہو گا میدان کے بیچ۔ ارے با بو کے بچے لا کھ بار تجھے سمجھایا کہ چھوڑ دوے ہم سے چالا کی مگر تو سنتا ہی نہیں اتوں کا بھوت بھلا باتوں سے مانتا ہے ابھی۔ چل تجھے کھر لے کر جاؤں گا۔ اماں نے بکی کی میٹھی روئی پکائی ہوئی ہے۔ دو نوں کھائیں کے۔“

رضاء کے کھر پنج بروہ دو نوں ایک طرف اکٹھے میں جا بیٹھے۔

”دیکھ بھائی، رضانے بات شروع کی دیکھنے تم اور احمد کیپ اور کپ کو پھانسے میں لگر ہے اور ہم دیکھتے رہے۔ یہ جیل اپنے بن کا نہیں۔ تم تماشہ کرتے رہے اور ہم دیکھتے رہے پھر تجھے امر تراوی کا چکر پڑا۔ اور تو اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ اور تو نے آ کر ہم سے ساری بات کہہ دی۔ وہ تو ٹھیک ہے ہم سے کہ دو گے یا تو ہم تو کیسے کیا۔ الٹا ہماری مد و تمہارے ساتھ ہو گی۔ کہو تو اٹھا کر لے آئیں اس امر تراوی کو۔ کیا ہے دو سال کی سزا ہو جائے گی ناجیل لیں گے تمہیں تو وہ سالی مل جائے گی۔ تم تو مزے کرو گے نا کیا یاد کرو گے کہ ہا کی سٹک والا یا رملاتھا۔“

”لیکن یہ جس معاملے میں اب چھنسے ہو تم یہ ہمیں پسند نہیں۔ اول تو وہ بچوں والی ہے دوسرے اس کامیاب تمہارا دوست ہے اور پھر چلو یہ بھی مانے لیتے ہیں لیکن بشرطیکہ تم اپنے منہ سے کہ دو اپنی زبان سے مانو اور کہو بھی مجبور ہوں بھنس گیا ہوں۔ پھر ہم مدد کے لئے تیار ہوں گے ایسے نہیں۔ چالا کی سے کام نہیں چلے گا ایلی۔ ہمارے ساتھ جس نے بھی چالا کی کی سالہ منہ کے بل گرا۔“

”تم کیا بک رہے ہو“ ایلی نے منہ پکا کر کے کہا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون بک رہا ہے،“ رضا بولا ”سارے محلے میں

شور مچا ہوا ہے ہر جگہ یہی بات ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“ ایلی نے پوچھا

”تم جو سارا سارا دن اور آدمی آدمی رات تک اس کے گھر میں گھسے رہتے ہو۔

تمہارے لیے وہاں چائے بنتی ہے۔ کھانے کھتے ہیں مٹھائیاں خریدی جاتی ہیں۔ لوگ اندر ہے نہیں۔ یہاں علی اپور میں بات چھپتی نہیں۔ یہ محلے والیاں تو تیور پچانتی ہیں۔“

”تمہیں مجھ پر یقین نہیں کیا،“ ایلی نے غصے میں کہا۔ ”بچھے دوست ہوتے مجھے دوست سمجھتے ہو مگر یقین نہیں کرتے میری بات پر۔“

”ایمان سے کہتا ہوں میراں گواہی دے رہا ہے کہ تم مجھ سے بات چھپا رہے ہو۔ اے نہ چھپا۔ مجھ سے نہ چھپا۔ ظالم اس کا نتیجہ اپھا نہیں ہوگا۔ تجھے یار نہ کہا ہوتا تو اب تک آگ لگادی ہوتی میں نے۔“

”رضا،“ ایلی آنکھوں میں آنسو چھکا کر بولا۔ ”میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولاتم سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رضا کے انداز کی درشتی یک قلم مفقود ہو گئی ”دیکھ ایلی،“ وہ بولا۔ ”میں تیرا دوست ہوں بول کیا چاہتا ہے تو چاہے جائز ہونا جائز ہو۔ روپیہ چاہئے تو مجھ سے لے چاہے چوری کر کے لاوں لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔ کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کوئے۔ اے ایک ایسی ہاکی سٹاک نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا۔ کیسے نہیں مانے گی وہ کس کی جان ہے جو ہمارے یار کی بات روکرے جینا مشکل کر دوں گا اور نہ مانے گی تو اور طریقے بھی ہیں۔ تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ ہو۔“

رضا کی آنکھیں بھرا ہیں۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی ”مجھے معلوم نہیں،“ وہ بولا۔ ”میں نے کبھی کسی دوست کے لیے اتنی محبت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں تم

سے مجھے اس قدر لگا تو کیوں ہے۔ تمہارا خیال کیوں رہتا ہے مجھے؟ وہ خاموش ہو گیا۔

ایلی کے دل میں اک بھیر لگ گئی۔ رضا کے اظہار محبت پر اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رضا کے گلے لگ کر روپڑے اور اسے ساری بات بتا دے لیکن جب وہ بات کرنے کے لیے منہ کھولتا تو شہزاد سامنے آ کھڑی ہوتی۔ مجھے بدنام نہ کرنا ایلی۔ کھلونا بنا کر مجھ سے کھینا نہیں۔ اس وقت شہزاد کی تمام ترقیتی اور شوغی غم و حسرت میں بدل جاتی اور ایلی بات کہتے کہتے کھلکھل جاتا۔ نہیں میں تمہیں بدنام نہیں کروں گا۔ تم کھلونا نہیں ہو شہزاد تم تو رانی ہو ملک ہو۔ تم سے بھلا کون حیل سنتا ہے لیکن اس کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجرم ہے جو اپنے عزیز دوست رضا کو دھوکا دے رہا ہے۔

مہارانی یا مہترانی

دیر تک وہ دونوں خاموشی سے بکی کی میٹھی روٹی کھاتے رہے پھر دھنما ساتھ والے مکان سے شہزاد کی حسین آواز یوں گونجی جیسے کوئی کوئی کوئی تان اڑا رہی ہو۔ اس آواز کو سن کر ایلی چونکہ اس کے جسم پر رو نگئے کھڑے ہو گئے۔

”ہاں وہی تو ہے“ رضاہنئے لگا ”اس کی آواز سن کر تمہاری کیا حالت ہو جاتی ہے۔“

”کیا حالت ہو جاتی ہے؟“ ایلی نے پوچھا

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟“ وہ بولا ”سنوسنوفضول باتیں نہ کرو،“

شہزاد کا تھکہ پھر سنائی دیا۔ اس کے ساتھ بحدی سی آواز میں کوئی نہ رہا تھا۔

”اس محلے کے جو ہڑیں یا اکیلی ایک ہی راج نہیں ہے۔ چلتی ہے تو جیسے پانی کی لہر انٹھر رہی ہو بولتی ہے تو جیسے کوئی کوک رہی ہو۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھزرتے ہیں۔ مگر ایلی“ رضا بولا ”میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہارانی ہے اور یا یا مہترانی،“

”کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا

”بس یا تو بہت ہی اوپنچی چیز ہے اور یا نجی ہے بے حد نجی یا تو واقعی پرستش کے لاکٹ
ہے۔ اور یا۔“

”ہر دوسرے چوتھے روز یا اس گھر میں آتی ہے جہاں اس وقت نہ رہی ہے۔
رضا نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور غفور یا ظفر کے ساتھ وہ فدائی کرتی ہے وہ تفہیہ لگاتی
ہے اور پھر با آواز بلند ذرا نہیں بھیجا کی ڈرتی نہیں۔ یا تو بڑے صاف دل والی ہے اور یا
بڑی چالاک عورت ہے۔ اللہ کرے رانی ہی ثابت ہو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔“

”ہونہہ“ شہزادی آواز شناختی دی ”ان کا لیا ہے وہ تو کبوتر کی طرح آنکھیں مومن کر
تفہیہ کی نے منہ میں دلب کر بیٹھ رہتے ہیں وہ کہاں آتتے جاتے ہیں۔ ان کا یہاں
چھٹی پر آنا نہ آنا را رہے ہے۔“ وہ تفہیہ مار رہتے گئی۔

”سن لیا“ رضا بولا ”وہ گدھ کہاں اس لاکٹ تھا کہ اسے سورنی مل جائے۔ ہے
واقعی سورنی۔ لیکن تمہیں کیا تم مجھ سے جھوٹ تو بولتے ہی نہیں۔“

رضا کے گھر سے نکل کر وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چلا آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا
کہ گھر جا کر چار پائی پر لیٹ جائے۔ رضا کی بات اس کے دل میں کائنٹ کی طرح
چھٹی تھی۔ اور شہزادی باتوں اور تفہیہ نے ان شبہات کو ہوا دی تھی شہزاد کے روپے
اور رضا کی باتوں کی وجہ سے ایلی کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔

ایلی کو غفور اور خدا واسطے کی نفرت تھی۔ اسے ان کے سارے خاندان سے نفرت
تھی۔ غفور کے چار بھائی تھے۔ ان کا تمام تر کنبہ محلے والوں سے الگ تھلک رہا کرتا
تھا۔ ان کی روایات ہی مختلف تھیں۔ وہ محلے کے اصفیوں سے زیادہ تعلقات نہیں
رکھتے تھے چونکہ ان کے والد بہر سے آ کر وہاں مقیم ہوئے تھے البتہ ان کی والدہ محلے
ہی کی لڑکی تھی جو رشتے میں ایلی کی دادی کی ہمشیرہ تھی۔

غفور ایلی سے عمر میں چار ایک سال بڑا تھا۔ غفور کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ

محض گوشت کا لوہڑا ہو۔ اس کی شخصیت میں جسم کا غصر بے حد غالب تھا۔ نگاہوں سے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ روح کی روشنی سے محروم ہو۔ جب وہ کھجاتا تھا تو اس کی آنکھوں میں گرنسنا جھلک واضح دکھائی دیتی تھی اور وہ اکثر نامناسب مقامات پر کھجا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کی نگاہیں تندی سے بھری ہوتی تھیں۔ بات کرتا تو اس میں جارحیت کا غصر جھلتا ایسی کی غفور سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسی میں کمتری کا احساس تھا اور غفور کا رو یہ بھولی عظمت اور زعم کا حامل تھا تمام بھائیوں میں صرف غفور کی شخصیت میں یہ غصر تھا باتی بھائی الگ رہنے کے باوجود شوکت نفس سے بھرے ہوئے نہیں تھے۔ وہ سب خوب غفور ہے نالاں تھے۔ اور بیوی حبابا پ تو اس کی وجہ سے سرا اسر زدج تھا۔

شہزاد کا غفور سے ملنا ایسی کو قطعی طور پر ناپسند تھا لیکن شریف کی سگی ہمشیرہ غفور کے بھائی الطاف سے بیانی ہوئی تھی ہند شہزاد کو وہاں جانے سے روکنا ممکن نہ تھا۔

شہزاد کو دوسروں سے بے تکلفانہ بات کرتے ہوئے سن کر ایسی محسوس کرتا تھا جیسے اس کی باتوں میں وہی دودھاری مفہوم ہو جس کا اظہار وہ ایسی سے کیا کرتی تھی اور اس کے اشارات اور کنایات اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں وہ محسوس کیا کرتا تھا جیسے شہزاد ہر کسی سے وعدے کرتی ہے اور اپنے خصوصی انداز میں اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے اس خیال پر وہ ایک عجیب وحشت میں بٹتا ہو جاتا۔ اس کا اپنا احساس کمتری شکوک کو ہوا دیتا اور وہ آتش رقاہت میں جلتا۔

صحرا نور دی

شہزاد کی باتیں سننے کے بعد اس کے لیے رضا کے پاس بیٹھے رہنا ممکن ہو گیا اور وہ اٹھ بھاگا۔ اسے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جانے کے لیے کوئی جگہ بھی تو نہ تھی۔ علی احمد کے گھر میں ٹین کا سپاہی رہڑ کی گڑیا سے کھیلنے میں مصروف تھا

باہر شیم آنسو بھاری تھی۔ ہاجرہ چپکے سے کونے میں کھڑی تھی جیسے اس گھر کے تمام افراد کی زر خرید غلام ہو۔ سیدہ چپ چاپ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ وہ یا تو نماز پڑھتی اور یا گھنٹوں میں سردے کر آلو چھینے میں مصروف رہتی۔ بڑے سے بڑا ہنگامہ بھی اس پر کوئی اثر نہ رکھتا تھا جیسے آندھی میں کوئی چھوٹا سا پودا جھک کر زمین پر لیٹ جاتا ہے چھٹ جاتا ہے حتیٰ کہ آندھی کا زور کم ہو جاتا ہے اور وہ پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ سیدہ کو دیکھ کر ایسی محسوس کیا کرتا تھا جیسے کسی بہت زور دار آندھی نے اسے ہمیشہ کے لیے ہموار کر دیا ہو اور اب یہ چھوٹے چھوٹے ہنگامے اس کے لیے بے معنی ہو چکے ہوں۔

علیٰ احمد کے گھر میں وہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ایسی کے لیے جاذب توجہ تھا۔ وہ کمرا جس میں دادی اماں رہا کرتی تھی۔ دادی اماں کی موت کے بعد وہ کمرا جوں کا توں پڑا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ تحنت و یسے ہی کونے میں بچھا ہوا تھا جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی اور اس کے پاس ہی وہ حکوم کھاتھا جس میں وہ ایسی کا گیند یا دوسری چیزیں سنچال کر رکھا کرتی تھی۔ چار پانیاں اسی طرح پانے ستون پر لگی ہوئی تھیں جن کے نیچے مٹی کے برتنوں کی قطاریں تھیں اور لوٹے چھوٹے صندوق رکھے ہوئے تھے۔

ان چیزوں کو دیکھ کر ایسی کا دل بھرا آتا تھا اس کمرے میں جانا ایسی کے لیے تکلیف دہ تھا پھر فرحت کا گھر تھا۔ وہاں فرحت کے علاوہ اجمل کے والد فیروز مقیم تھے۔ نیچے فرحت اور ہاجرہ رہتی تھیں اور پر چوبارے میں فیروز رہا کرتے تھے۔ فیروز کو وقت پر نہانے وقت پر چائے پینے کھانا کھانے اور وقت پر سیر کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ان مقررہ کاموں کے علاوہ یا تو وہ سارا دن چارپائی پر پڑے رہتے اور یا رمل اور نجوم کی جنتروں کا مطالعہ کیا کرتے۔ نیچے فرحت بیٹھی کپڑے دھونے یا سینے یا کھانا پکانا میں مصروف رہا کرتی تھی۔ ایسی کے لیے وہاں بیٹھنا بے حد مشکل تھا۔ اول

تو وہ کمرے بے حد اداس تھے۔ دوسرا فرحت جوش محبت کی وجہ سے ہربات میں ایلی کی بھلائی اور بہتری کا تمذکرہ کرنے کی عادی تھی۔ اور ایلی کی بھلائی اور بہتری کے متعلق فرحت کے خیالات سے ایلی کو قطعی طور پر اتفاق نہ تھا۔ فرحت ایلی کی لائقی کو محسوس کر کے شہزادکا قصہ چھینڑ دیتی تھی اور رٹز میں فرحت کا جواب نہ تھا۔

محلے میں وہ کسی کے ہاں جانے کا عادی نہ تھا۔ اسے دوسروں کے گھر میں جاتے ہوئے وحشت ہوتی تھی محلے والیاں اگرچہ یہی محبت اور ہمدردی سے اسے ملا کرتی تھیں۔ لیکن ان کی ہمدردی میں ترس کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ اب کے علاوہ فطری طور پر وہ لوگوں کی نگاہوں سے گریز کرتا تھا۔ چاہئے ان میں ہمدردی ہو یا تحسین اس کے لیے باہر لکنا بھی مشکل تھا چونکہ آصفی محلے کی ڈیواریوں میں عورتوں کا جنمگھا ضرور ہوتا تھا۔ چوگان میں بیٹھے گر عورتیں اپنے کام کاچ کیا کرتی تھیں جیسے وہ گھر کا صحن ہو۔

عورتیں بالے کے مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھی رہتی تھیں یا تو وہ اپنے اپنے کام میں منہمک ہوتیں اور یا خالی بیٹھ کر باتوں میں مصروف رہتیں۔ محلے میں آزار بند بنتا سب سے بڑا مشغله تھا۔ اور آزار بند بننے میں محلے کی عورتوں کو اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ ان کی انگلیوں پر تاگے کھیلتے تھے۔ نگاہیں آوارہ رہتی تھیں اور زبانیں یوں چلتی تھیں جسے قینچیاں ہوں۔ اندر کسی اندھیرے کمرے میں بالاتخت پر اپنی چیزیں رکھے بیٹھا آپ ہی آپ باتیں کرتا رہتا۔

اس روز ایلی نے سوچا چلو بالا کے ہاں جا بیٹھو کچھ وقت گزر جائے گا۔ جب وہ چوگان میں پہنچا تو شہزاد کے چوبارے کی کھڑکی میں کسی نے اشارے سے اسے بلا یا۔ نہ جانے کون ہے، ایلی نے سوچا۔ شاید جانو ہو۔ پھر اس نے شریف کی آواز پہچان لی کھڑکی میں شریف کھڑا سے بلا رہا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے وہ سوچنے لگا۔ بہر صورت شریف سے انکار کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

چو بارے میں شریف اکیلا بیٹھا تھا ”وہ تو محض اتفاق سے میری نگاہ پڑ گئی“ شریف نے کہا ”ورنہ تم تو شاید آتے ہی نہ۔ کیا بات ہے ایلی؟“ شریف نے ملتختی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”تم ہم سے اس قدر گریز کیوں کرتے ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے بلا یا ہے کہ تھائی میں شاید تم مجھے اپنی نہم کا قصہ سناسکو شہزاد کے سامنے تو اچکچا تے ہونا۔ بتاؤ کبھی مل جھی ہے تم سے۔“

ایلی مسکرا دیا
”ڈر نہیں میں کسی سے نہیں کہوں گا، وہ بولا“ گھبرا دیں،
ایلی کی سمجھیں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے ”ملے نہ ملے“ وہ بولا ”مطلوبِ وجہ بے سے
ہےنا؟“

”بالکل بالکل“ شریف کا چہرہ مسرت سے جگدا اٹھا اگر جذبے میں خلوص ہے تو سمجھ لو بیڑا پار ہے سچ کہتے ہو سچ کہتے ہو۔ شریف نے ٹھنڈی آہ بھری ”چاہے بتاہ ہو جاؤ۔ لیکن جذبے میں خلوص اور شدت قائم رہے۔ ایسی تباہی پر سینکڑوں آبادیاں قربان ہیں۔ اچھا اس کے عزیزوں کو علم ہے کیا؟“

”معلوم نہیں“ ایلی نے کہا ”شاید علی ہو۔ لیکن کیسے معلوم ہو سکتا ہے انہیں میں نے تو کبھی کسی سے بات نہیں کی اور اب اکتو ابھی اپنے چاؤ سے فرصت نہیں۔“

شریف ہنسنے لگا

”اے اپنے چاؤ سے فرصت کیسے ملے، شہزاد داخل ہو کر بولی“ سارا محلہ چھان مارا میں نے لیکن تمہارا پتہ نہ چلا۔ پہلے بالے کے باں گئی پھر ارجمند کے گھر گئی ادھر غفور کی طرف جا پہنچی وہاں نہ ملا تو میں نے کہا شاید اپنے ابا کے پاس بیٹھا ہو۔ آخر اپنی نئی اماں کو بھی تو سلام کرنا تھا۔“

”دیکھ لے ہم نے بیٹھے بیٹھے تلاش کر لیا“ شریف نے کہا ”کچے دھاگے سے بندھا آیا ہے۔ چاہے پوچھ لے اس سے خود نہیں آیا یہ“

شہزادے آہ بھری ”ہمیں یہ کچا دھا گا نصیب نہ ہوا۔ ہم نے اپنی زندگی ویسے ہی کھو دی۔ ہمیں اللہ نے عشق نصیب ہی نہ کیا۔ اپنے اپنے نصیب ہیں جس کے ساتھ ہماری شجوگ ملے وہ پہلے ہی سے کسی اور کے ہو چکے تھے“

”اچھا“ شریف بولا اس کے انداز میں احتیاج تھا۔

”غلط کہہ رہی ہوں گیا“ شہزادہ چمک کر بولی ”میاں اپنی دھن میں بیٹھے رہتے ہیں ایلی اپنی دھن میں آوارہ رہتا ہے۔ ایک میں ہوں جو بغیر کسی دھن کے کوئے کی طرح یہاں سے اڑا کیا وہاں جائیں گی۔“

”اب پچھیوں کو حصی کون بننے کا شوق چرا کیا؟“ ایلی بولا

”پچھی“ شہزادے تھے سے ایلی کی طرف دیکھا ”کبھی تھے ہی پچھی“

”کیا کہہ رہے ہو تم تمہاری باتیں میری کبھی میں نہیں آتیں“ شریف بولا
”نہ ہی آئیں تو بہتر ہے“ شہزادے نہنے لگی ”محسوسات کی دنیا میں رہنے والوں کو
سمجھنے کی کیا ضرورت؟“

”اچھا بھی تم جو کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا“ شریف آہ بھر کر بولا اور پھر خاموش ہو
گیا۔

کروٹیں اور قیقے

رات کے وقت جب ایلی چارپائی پر لیٹا تو اس کے دل میں متضاد قسم کے
احساسات تھے۔ شہزادہ اور شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اسے شریف پر ترس آتا تھا۔
اس وقت شریف کی حیثیت بیچ ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور شہزادہ کی باتیں اور اس کے
اشارة ایلی کے دل میں پختہ یقین پیدا کر دیتے تھے کہ وہ اس سے کھیل نہیں رہی
 بلکہ اس کی لگن میں بری طرح سے مرشار ہے۔ لیکن جو نہیں وہ اسکیلے میں لیڈتا تو شہزادہ
کی باتیں دھنڈلی پڑتی جاتیں اور ارجمند اور رضا کی آوازیں بلند ہوتیں۔ میں بتاؤں
ایلی یا تو وہ مہارانی ہے اور یا تو مہترانی۔ مہترانی مہترانی دور کوئی چلاتا پھر غفور کی

بحدی آواز ابھرتی اور شہزادی کر کھٹی ان کا کیا ہے ان کا یہاں چھٹی پر آنا نہ آنا برادر ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ کھلاڑی! محلے کی مسجد کے گنبد سے کوئی الوجینا کھلاڑی دور کوئی چپکا دڑاس کامنہ چڑا تی۔

پھر ایک رنگین اور شوخ کھلاڑی اس کے رو بروآ کر کھڑی ہو جاتی اور وہ شریف کو اشارے کرتی۔ اپنی طرف بلاتی۔ اور اس کا جسم ابھرتا سمیتا جیسے شدید خواہش اسے بلوار ہی ہو۔ پھر اس کے کپڑے دھجیاں بن کر لائز جاتے اور وہ بہرنہ رہ جاتی۔ اس وقت ایلی محسوس ہوتا جیسے وہ انہوں نے اس خیال پر اس پر دیوالیکی طاری ہو جاتی۔ اس کے دل کی انتہا گھرا یوں نے ایک کرب امتحاناً اور جسم کے روئیں روئیں کو یوں دھنکتا جیسے روئی کا گالا ہو۔ وہ دیوانہ اور چاہوپانی پر کروئیں بدلتا۔

ساری رات وہ چارپائی پر ترپتار ہتا تھی کہ صبح کاذب کا وقت ہو جاتا اور پھر تھک کر اس کی آنکھ لگ جاتی۔ پھر بھی اس سونے کو نیند سے تعلق نہ ہوتا۔ جیسے کوئی مر یعنی کسی خوف ناک تکلیف کے تحت کچھ عرصے کے لیے تھک ہا کر بے جان ہو کر پڑ جاتا ہے۔

اسی لیے صبح جب وہ جا گتا تو وہ تازگی محسوس نہ ہوتی۔ جو نیند کے بعد انسان محسوس کرتا ہے۔ بند بند درکرتا اٹھن کی وجہ سے اعصاب دکھتے۔ اور چہرے پر پڑ مردگی چھائی ہوتی۔ ابھی وہ رات کی وردات کی تعلق سوچ رہا ہوتا کہ میر ہیوں میں کسی کے پاؤں کے رقص کی آواز گوئی اور چھن سے شہزاد اس کے رو بروآ کھڑی ہوتی۔

”چل اٹھو وہ چائے کے لیے کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی لاٹ صاحب جا گے بھی نہیں۔ کیا زندگی ہے جیسے کوئی نواب زادہ ہو، وہ ہنسنی شہزاد کی باتیں سن کر اس کی تمام تر تھکن فرو ہو جاتی۔ اس کی ہربات محبت کا پیغام ہوتی اور یہ پیغامات ایسی شوٹی اور رنگینی سے ایلی تک پہنچائے جاتے کہ اس پر نئے کسی کیفیت طاری ہو جاتی اور رات کے شکوک اور بے خوابی گویا اسے یاد ہی نہ

رہتے۔ اگر کسی وقت اسے رات کے کرب کا خیال آتا بھی تو وہ نہ سوچتا۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں وہ سوچتا جو خواہ جنواہ کے شکوک پال لیتا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود پھر جب رات پڑتی تو دن کے وہ لطیف اور رسمیں پیغامات اس کے ذہن سے مت جاتے اور اس کی تکمیل کے سامنے وہی بھیا نک تصاویر متھر ک ہو جاتیں اور وہ شدت کرب سے رُتپتا اور کروٹیں لیتا۔ رُتپتا اور کروٹیں لیتا حتیٰ کہ صحیح کاذب کے وقت تھک کر بے ہوش ہو جاتا۔

اس طرح اس کی زندگی وہ ذہنی حیثیت اختیار کر گئی اس کے ساتھ ہی شہزاد کی شخصیت اس کے نزدیک رواحہ اور راہ و رونوں کی خصوصیات سے مزین ہو گئی وہ بیک وقت اسے پاکیزہ تین حصوں محبوب، محبوبہ اور چالیاڑ کھلاڑی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ساعت میں ایلی اسے خلوص بھرے جدے کرتا تھا۔ دوسرا ساعت میں ناگن سمجھ کر اس سے دور بھانگنے کی کوشش کرتا۔

یہ کیفیت ایک دیوالگی کی حیثیت اختیار کر گئی حتیٰ کہ اس کے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ آیا وہ اس حسین اور پاکیزہ دیوی کی وجہ سے وہاں سیکھنے پر مجبور کر رکھا تھا اس دلش ناگن سے ڈسے جانے کے شوق نے اسے وہاں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کرب کی شدید لذت جو وہ رات کے وقت محسوس کیا کرتا تھا اسے شہزاد سے محبت کرنے پر مجبور کر رہی ہوا اور ایذہ اپستی کا جنون اس کے سر پر سوار ہو۔

بہر حال یہ تو ایک مسلم امر ہے کہ اگر شہزاد صرف حسین و جمیل عورت ہوتی تو شاید ایلی کے دل میں اس کے لیے اس قدر عظیم جذبہ پیدا نہ ہوتا اور ہوتا بھی تو اسے قدر دوام حاصل نہ ہوتا۔

جو گہ

کچھ دن کے بعد ایلی کا نتیجہ نکل آیا وہ الیف اے میں پاس ہو گیا۔ علی احمد نے اسے تھرڈ ائیر میں داخل کرنے کے لیے لا ہور بھیجنے کا فیصلہ کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے

ایمیل کو بہت لمبا چوڑا لکھ پر دیا۔

ایمیل ان کی باتیں بڑے غور سے سن تارہا جب وہ سب داؤ اور گرتا چکے تو ایمیل نے کہا ”دیکھئے ابا جان آپ کے فرمان بالکل درست ہیں لیکن آپ مجھے اسلامیہ کالج میں داخل نہ کرائیں چونکہ وہاں کام احوال یہاں ہے کہ وہاں میں اطمینان سے نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ ان بے ضابطیوں کا اعادہ نہ ہو جو پہلے مجھے سے سرزد ہوئی ہیں تو مہربانی سے مجھے گورنمنٹ یا مشن کالج میں داخل کروادیجھے“

”ہاں ہاں“ وہ بولے ”ہمیں اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے“

اس کے بعد انہوں نے مختلف لاکوں کو اداہر اور بھیجا تاکہ وہ ٹینوں کالجوں کے پاپکش لے آئیں۔ پاپکش مہیا کرنے کے بعد وہ اپنے بڑے بڑے رجسٹر لے کر چٹائی پر بیٹھ گئے اور سارا دن مختلف کالجوں کی فیس اور دیگر اخراجات جوڑتے رہے انہوں نے رقمیں بار بار لکھیں بار بار انہیں جمع کیا ایک میزان کو دوسرے میزانوں سے ملایا۔ اور کئی ایک گھنٹوں کے بعد اطمینان سے سراٹھا کر بولے ”ٹھیک تو ہے تم کل ہی لاہور روانہ ہو جاؤ اور جا کر اسلامیہ کالج میں داخل ہو جاؤ۔“

”لیکن آپ نے تو کہا تھا“ ایمیل بولا ”کہ آپ مجھے کسی اور کالج میں داخل کریں گے“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیسے ممکن ہے“ وہ نگے پیٹ کو کھجاتے ہوئے بولے ”سیدہ او سیدہ ذرا ادھر آنا۔ آنا ذرا ایک منٹ کے لیے“ اور جب سیدہ آئی تو کہنے لگی ”سچلا بتاؤ تو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم ایمیل کو مشن کالج میں داخل کرائیں۔ جب اپنا اسلامی کالج موجود ہو تو عیسائیوں کے کالج میں کیسے داخل کرائیں کیوں سیدہ ایمان سے کہنا“

”ہے“ سیدہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی ”اس عیسائی کالج میں جہاں اپنے محسن کا لڑکا

پروپری ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بس عیسائی ہو گیا اور نتیجہ کیا ہوا مان نے اسی غم میں جان دے دئی اور باپ کا جو حال ہو رہا ہے وہ کس سے چھپا ہے۔“

”دیکھو سیدہ“ وہ بڑی سمجھدگی سے بولے ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے گورنمنٹ کے کالج میں داخل ہو جائے یا عیسائیوں کے کالج میں دس ایک روپے کا فرق پڑ جائے تو کیا ہوا۔ مطلب تو یہ ہے کہ تعلیم اچھی ہو جائے تو رکے کی۔ بس صرف یہ خیال آتا ہے کہ اگر اپنا اسلامی کالج موجود ہے تو پھر کیا ہمیں ایلی کو عیسائیوں کے کالج میں داخل کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ دم پر رہا۔ جو تم کہو ہی کروں گا میں ذرا شیم کو بھی بلا لوں نا۔ اس کی مرتبی بھی پوچھ لیں۔ اور ہبہ جرم کہاں ہے اس کا موجود ہونا بھی ضروری ہے کیوں سیدہ؟“

سیدہ شیم کو بلانے گئی تو وہ اٹھ کر بھنگ میں جا کھڑے ہوئے اور چلا چلا کر محلے والیوں کو بلانے لگے۔ میں نے کہا مائی برکتے ذرا آنا تو ایک منٹ کے لیے اے بی بی نھ تو کیا کر رہی ہے۔ ہر وقت آزار بند ہی بنتی رہتی ہے کبھی اللہ اور رسول کا کام بھی کر لیا کر۔ آذر ایہاں تیرا مشورہ لیتا ہے بہت ضروری بات ہے۔“

علی احمد نے شورچا کر محلے والیوں کو اکٹھا کر لیا اور پھر اس جرگے کے سامنے ایلی کے داخلے کا مقدمہ نہایت خوبصورتی سے پیش کر دیا۔ محلے والیاں یک زبان ہو کر علی احمد کی رائے پر عش عش کر رہی تھیں۔ اور وہ بار بار چلا رہے تھے ”دیکھ ماں برکتے میرا کیا ہے مجھے تو رکے کو داخل ہی کرنا ہے نا۔ یہاں نہ کیا وہاں کر دیا۔ کیا فرق پڑتا ہے اول تو آخر اجات میں کی زیادتی ہوتی نہیں اور اگر ہو بھی بی بی نھ تو کیا ہے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کون ہوتا ہے۔ انہیں کے لیے محنت مزدوری کرتے ہیں ہم اور پھر جہاں سو وہاں سو اسو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اب سوچ لو تم ایک تو عیسائیوں کا کالج ہے جہاں عیسیٰ مسیح کی بائبل پڑھتے ہیں اور دوسرا ہے اپنا اسلامی کالج جہاں اللہ اور رسول کے احکامات اور اسلام کے ارکان کی تعلیم دیتے ہیں۔ اب تم ہی فیصلہ کر لوہاں“

بجھوں کے نیچلے کے بعد علی احمد نے ایک بار پھر رجسٹر میں اندر اراج شدہ رقوم کے میزان دیکھے۔ ایک بار پھر تمیں جمع کیں اور پھر یوں فاتحانہ اندراز سے مسکرانے لگے جیسے کوئی سوداگر بہت بڑے منافع کا سو داغپنا کر گردو پیش پر نگاہ ڈال رہا ہو۔

اگلے روز میر ھیوں میں دھماچوکرٹی کی آواز کے بغیر چھن چھنان کیے بغیر شہزاد پچکے سے داخل ہوئی تو جا رہا ہے، وہ بولی "سنا ہے کان الج میں داخل ہونے کے لیے جا رہا ہے۔"

"ہاں" ایلی نے کہا تمہارے لیے یافرق پڑتا ہے"

"پڑتا ہے" وہ بولی "صرف مائنھوں میں کافر قل ہے۔ چار گھنے کافر قل سمجھو"و

"اچھا" وہ ہنسا میں تو سمجھا تھا کہ،

"یہ سمجھو کی بات نہیں ہاں" وہ بولی یہ احساس کرنے کی بات ہے چلو وہ چائے پر بلاء ہے ہیں۔"

ایلی بگڑ گیا "میں نہیں جاتا وہ بلائے والے کون ہیں"

"بلائے والے کا خیال نہ کرو۔ بلاوی کا تو خیال کرو، ہیری طرف دیکھو" وہ بولی

"نہ میں نہیں دیکھتا" وہ منہ پھیر کر بولا

"ویکھے بغیر رہ بھی سکو گے" وہ ہنسی

فرحت پچکے سے داخل ہو کر جھٹ سے بولی "کون کے دیکھے بغیر نہیں رہ سکے گا"

"میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی" شہزادہستے ہوئے کہنے لگی

"کے دیکھے بغیر" اس نے پوچھا

"تمہیں اور کے، شہزادہ نے چلی گئی

"مجھے؟"

اور کیا ایلی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس ایلی کے ذرا اپنے بھائی کی صورت تو دیکھے نہ جانے بھائیوں کے متعلق ہنیں غلط فہمیاں کیوں پال رکھتی ہیں۔

”چلو بھی اب کہ مجھے فرحت سے پٹوا کے رہو گے، وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی“
چلو بھی اور ایلی پچکے سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہولیا“

ایلی کا خیال تھا کہ شریف کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ لا ہور جائے گا تاکہ
ایک روز شہزادے اکیلے میں ملنے کے لئے شریف نے پچکے سے اپنی چھٹی بڑھائی تھی
اس لیے اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ ادھر علیٰ احمد تقاضا کر رہے تھے۔ کہ جلد جائے
الہذا سے اپنی مرضی کے خلاف لا ہور جانا ہی پڑا۔ جاتے وقت اس نے ان بھے
آنسوؤں سے شہزاد کی طرف دیکھا اور ہونٹ ہلانے بغیر اشہاروں کی مدد سے شہزاد
اور اظہار درود ل کیا اور رخصت ہو گیا۔

تیاگ

حسن منزل

گاڑی علی پور کے شیشیں سے روانہ ہوئی تو ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ جارہا ہے۔ شہزادے دو رجرا بارے ہے۔ اس کے گورے چھپا ہمبوں سے دو راس کے لٹکتے ہوئے بازوؤں سے دو رناؤں کی ڈولتی آنکھوں اور ماتھے کے تلک سے دو رپھرائے ان رنگیں اور شوخ عہدو پیان کا خیال آیا جو انہوں نے شریف کے روپر و ولیف کنایوں اور رنگیں اشارات کی مدوبے ایک دوسرے سے گئے تھے۔ اس کے دل میں اضطراب حوالے گا۔

کیا میں ان رنگیں میں سے محروم ہو جاؤں گا؟

کھڑکی سے باہر شہزادہ مسکرا رہی تھی ”کیا فرق پڑتا ہے“ وہ نہ رہی تھی ”چار گھنٹے کا فرق“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی

ایلی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی

”میری ہے تو پھر کیا غم!“ اس نے سوچا پھرائے شہزادے کی وہ بات یاد آگئی جب ایلی نے اکیلے میں شہزادے کہا تھا

”شہزادا اگر میں وہاں سے نہ آ سکا تو پھر میں تمہیں کیسے دیکھوں گا۔ اتنی دیر دیکھے بنا کیسے رہوں گا،“

یہ سن کر وہ نہ پڑی تھی۔

”اتنی دیر نہ رہنا دیکھے بنا اور کیا“

اور اس نے جواب میں کہا تھا ”اگر رہنا پڑے تو؟“

تو وہ بے پرواہی سے بولی تھی ”تو کیا ہو اتم نہ سکو گے تو میں آ جاؤں گی،“

”تم آؤ گی لا ہور،“ ایلی نے حیرت سی شہزادے کی طرف دیکھا تھا

”کیوں،“ شہزادہ نہ کر بولی تھی ”اس میں کیا مشکل ہے۔ ایک گاڑی سے آؤں“

گی۔ دوسری سے لوٹ آؤں گی۔ تم دیکھ لینا جی بھر کے،
کتنی جرأت تھی اس میں

ریلوے شیشن سے وہ سیدھا کالج پہنچا اور علی احمد کی ہدایات کے مطابق دفتر میں
داخلہ اور فیس ادا کرنے کے بعد حسن منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ جہاں اسے رہنے
کے لئے جگلی ملحتی۔

اس نے کوشش سے حسن منزل میں جگہ لی تھی کیونکہ ریواز ہوٹل میں رہنا پسند نہ
تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ریواز ہوٹل سے گزشتہ کئی ایک تنخ یادیں وابستہ تھیں
اور وہاں اب بھی گاؤں کے چودھری بھرنے پڑے تھے۔ وہی چودھری جن کے
سامنے گاؤں کے کہیں فوکر ہوتے۔ حقدا اور تبا کوکی قیلیاں ہوتیں اور جوشوار کی جگہ
چادریں باندھے یوں بورڈنگ میں ٹھوٹتے پھرتے جیسے ریواز ہوٹل ان کے گاؤں
کا کھیت ہو وہ چلا چلا کر بات کرتے۔ بات بات پر کھکھارتے۔ بورڈنگ کے
نوکروں کو گالیاں دیتے۔ وہ مکاتے اور ہر بیٹھ کے کو گھورتے۔

اسلامیہ کالج کے اب تین بورڈنگ تھے۔ ریواز ہوٹل اور رحیم بلڈنگ تو کالج کی
عمارت کے پہلو میں واقع تھے اور حسن منزل کافی فاصلہ پر تھی۔ کالج والے حسن
منزل کے قریب کوپ روڈ پر ایک نیا بورڈنگ بنوارے تھے۔ لیکن یہ نیا کریمٹ
ہوٹل ابھی زیر تعمیر تھا۔

تالگی میں بیٹھے ہوئے ایلی غور سے لا ہور کے ان علاقوں کو دیکھتا رہا۔ جنوب کی
طرف ایک وسیع میدان تھا جس میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ اس وسیع میدان میں دو
ایک مکانات زیر تعمیر تھے۔ بیڈن روڈ پر چند ٹوٹے پھوٹے ویران سے مکانات
تھے۔ میکلوڈ روڈ ویران مرٹک تھی جس کے دونوں طرف کوئی عمارت نہ تھی۔

میکلوڈ روڈ، کوپ روڈ اور بیڈن روڈ کے وسیع پرانے کے عین درمیان میں حسن
منزل واقع تھی۔ اس وسیع اور ویران علاقے اور وہ واحد دو منزلہ بلڈنگ تھی۔ میکلوڈ

روڈ پر آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف ایک مرٹک جس کے غربی حصے میں یہاں وہاں اکا دکا عمارت کھڑی تھی۔ کوپر روڈ اور بیڈن روڈ کا تمامتر علاقہ ویران تھا جہاں رات کے وقت گز رنا آسان نہ تھا کیونکہ اس علاقے میں چوری اور ڈیکیتی کی واردات عام تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر صرف ایک سینما بیل تھا جس کا نام ایمپرس سینما تھا اور جہاں زیادہ تر نامی فلم دیکھتے تھے۔ فلم کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو گالیاں بکتے مونگ پھلی کھاتے اور متحرک گھر خاموش تصاویر میں ہیروئن کی نالگیں دیکھ کر چمگا دڑوں کی طرح چینیں مارتے تھے۔

حسن منزل ایک بہت بلندی وہ منزلہ عمارت تھی جس کی محلی منزل میں ایک ہوٹل تھا اور اوپر کی منزل کا لج نہ کرایہ پرے رکھی تھی اس منزل کے پچھواڑے میں ایک پرانا ٹکیہ اور اکھاڑہ تھا۔ منزل کے میں مقابل میں ایک پرانی کوٹھی جس میں ایک پارسی شراب بیچتا تھا۔ اس کے گاہک زیادہ تر نامی تھے جوڑھائی آنے میں ڈرافٹ بیڑ کا گلاس خریدتے تھے۔ اور ایک گلاس سے دو بوتل کا نشہ حاصل کرنے کے لئے شور مچاتے دنگا کرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔

حسن منزل کی اوپر کی منزل کا لج والوں نے اس لئے کرایہ پرے رکھی تھی تاکہ بورڈروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ دی جاسکے۔ غالباً کا لج کے ناظموں کو بورڈروں میں صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ ان کی وجہ سے کا لج کی آمد نی میں اضافہ ہو رہا تھا ورنہ حسن منزل کو کا لج کے نوجوانوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ سمجھتے۔ حسن منزل تو کیا ریواز ہوٹل بذات خود کا لج کے لڑکوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ رہا تھا کیونکہ اس کے گرد بہت سے مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ ریواز ہوٹل کے مقابل کا لج کے مشرقی سرے پر جو عمارت بورڈنگ کے طور پر خریدی گئی تھی اس کی کھڑکیوں سے تو گردوں والے کے تمام مکانات کے اندر ورنی حصے تک دکھائی دیتے تھے۔

حسن منزل کے جس کمرے میں ایلی کو جگہ ملی وہاں کل تین سیٹیں تھیں۔ ایلی کے

علاوہ وہاں دوڑ کے تھے ایک کا نام جمال اور دوسراے کاریاضت تھا۔ ریاضت ایک دبلا پتلا طالب علم تھا جس کی ناک چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی اور جس کی آنکھیں روئی سی تھیں۔ جب وہ چلتا تھا تو اس کا سر جسم جھوٹا تھا۔ اعضاء اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے تھے جیسے وقت طور پر گزارہ کرتے کے لئے فٹ کے بغیر جوڑ دینے گئے ہوں۔ وہ خوبیات کرنے سے گز کرتا تھا لیکن کوئی بات کرتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے بلکہ یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے کافوں کے اوپر کے حصے ذرا سالم ہائیتے تھے تاکہ بات کا کوئی حصہ کان سے ٹکرنا بہرہ نکل جائے بات سننے وقت اس کی آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ بیات کو قطعی طور پر نہیں سمجھ رہا۔ اس کے چہرے پر غمی، خوشی غصہ یا شرارہ کا ظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ وائی طور پر اس کے چہرے پر ایک کیفیت گویا کندہ کردی گئی تھی جیسے کہہ رہا ہو۔ ”معاف سمجھنے بات سمجھ میں نہیں آئی“۔۔۔ بات کو سننے اور سمجھنے کے باوجود اس کے چہرے پر لاعلمی اور بے بسی کے ملے جلے جذبات طاری رہتے تھے۔ جمال اونچے لمبے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ رنگ گورا تھا بال منہرے تھے آنکھیں بھویر اور خدو خال ستواں ہونے کے باوجود درانہ قسم کے تھے۔ اس کا جسم بھرا ہوا اور اعضاء میں ایک چک تھی۔

جمال لاپور کے کسی چک کا رہنے والا تھا۔ اس کی عادات دیہاتی رنگ لئے ہوئے تھیں۔ مثلاً وہ تہہ بند باندھنے، لمبی کا کرتے پہننے اور پھر پھر پور قیقہ لگانے میں خاص سرست محسوس کیا کرتا اور اسے جسم کھجانے کی عادت تھی۔

چار ایک روز وہ تینوں ایک دوسرے سے جھجک محسوس کرتے رہے اور تکلف بر تھے رہے لیکن جلد ہی جمال ایلی سے کھل کر باتیں کرنے لگا۔ جمال اور ایلی دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ریاضت کے ان سے گھل مل جانے کی توقع بے سود ہے کیونکہ وہ اپنی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہے۔

کالج سے واپسی پر ایلی اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور خیالات کی دنیا میں کھو جاتا۔

کمرے کی مشرقی دیوار آہستہ آہستہ سرگتی۔ ایک زینہ نمودار ہوتا۔ پھر اس زینے سے دھما
چوکڑی کی آواز آتی اور چھن چھنان سے کوئی اس کے رو بروآ کھڑی ہوتی

”چلو: وہ چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

ایلی چونک پڑتا اور گھبرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا۔ ریاضت چپ چاپ دیوار
سے ٹیک لگائے ہاتھ میں گتاب لئے چھت کی طرف گھور رہا ہوتا۔ جمال اپنے کپڑوں کو
تہہ کر کے سر پالنے تک جمانے میں شدت سے مصروف ہوتا۔ ایلی سوچنے لگتا شاید انہوں
نے شہزاد کے قدموں کی اوڑاں پائی ہو۔ شاید وہ اس کے راز سے واقف ہو گئے ہوں
شاید۔

پھر وہ اپنے امتحانہ خدمات پر نہیں دیتا۔ ”میں بھی پاگل ہوں۔“ وہ سوچتا۔ اپنے
دوںوں ساتھیوں کو اپنے آپ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر اسے خیال آتا۔ نہ جانے ان
دوںوں پر کیا بیت رہی ہے۔ اس کمرے میں ہوتے ہوئے نہ جانے یہ یہاں کہاں گھوم
رہے ہیں۔ بیچاروں کو اپنی پڑی ہے۔

نامی

ریاضت کو چھت کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اسے شریف یاد آ جاتا شاید ریاضت
بھی ایک شریف ہو جو کسی انور کے خیال میں اپنی سدھ بدھ کھو چکا ہو۔ نہ جانے اس پر کیا
افتاد پڑی ہے۔ اس کے محلے والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کہ یہ شریف بن
گیا ہے۔ جمال کو ریشمیں رومال سے منہ پوچھتے ہوئے دیکھ کر اس کی نگاہ تک ریشمیں
رومال سے گورے چٹے ہاتھ نکلتے۔ مخروطی انگلیاں اس کے گالوں کو سہلا تیں لیکن جلد ہی
جمال کا بھونڈا اقہقہہ اسے چونکا دیتا۔

”اے یار۔“ وہ ہستے ہوئے کہتا: ”مجھے اچھے رمال کی پہچان نہیں۔“

ایلی کی نگاہوں میں وہ رومال پھیلنا شروع ہو جاتا۔ اس میں سوراخ ہو جاتے اور ان
سوراخوں سے کیپ اور کپ اس کی طرف جھانکنے لگتے اور ارجمند مسکرا کر کہتا:

”ہاں۔ اس کھیل میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ اسے تھامنے رکھو۔ یوں گال سہلاو۔ ہوا میں اڑا دو یوں۔ مطلب ہوا آنا ذرا ادھر بھی مری جان کبھی کبھی۔“

اور پھر شہزاد چھن سے ادھر آ جاتی اور ارجمند کپ کیپ سب ماند پڑ جاتے۔ وہ مسکرا کر اسے کہتی۔ ”صرف سائٹھ میں کافر قبیلے ہے صرف سائٹھ میں کا۔“

رومی کو منہ پر رکھ کر جمال انگڑائی لیتا اور پھر تھہ بند کھجاتا اور دو ایک گرم گرم آ ہیں بھر کر باہر برآمدے میں نکل جاتا۔ چند ایک منٹ کے بعد وہاں سے وہ ایلی کو پکارتا:

”اندر کیا کرو ہے ہوتم۔“ بے کار بیٹھ رہتے ہو یار! یہاں آ کر یہاں نیچے اتنے سارے نامی اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سالوں نے پی رکھی ہے اور دیکھو تو کیا گیا حکمتیں کرو رہے ہیں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنستا اور جو شہزادی میں بھر کر جھجاتا تھہ بند جھاڑتا اور گرم گرم آ ہیں بھرتا۔

”وہ دیکھو سامنے..... ارے ارے وہ بھاگے وہ بھاکے سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ بھاگ کیوں رہے ہیں سالے۔ اس موڑ سائیکل کو دیکھ کر ڈر گئے ہیں کیا۔ کیوں ایلی۔ یہاں می موڑ سائیکل کو دیکھ کر بھاگتے کیوں ہیں؟“

”جب بھی موڑ سائیکل آتا ہے۔ یہ سب یوں بھاگ لیتے ہیں جیسے..... اور یہ ہوں والا دیکھا تم نے۔ یہ جو نخلی منزل میں ہوٹل ہے۔ گاہک آتے کبھی دیکھا نہیں کسی نے یہاں ویسے سالوں نے ہوٹل کھول رکھا ہے اور پھر یہ ہوٹل کا مالک شام کے وقت برآمدے میں ٹھلٹا رہتا ہے اور اندر ہوٹل خالی پڑا رہتا ہے۔ اچھا کار و بار ہے یہ یار میں ذرا موڑ سائیکل دیکھ آؤ۔“

یہ کہہ کر جمال کھجاتا ہوا اور تھہ بند جھاڑتا ہوا نیچے اتر جاتا اور..... پھر سیڑھیوں سے شہزاد نکل آتی۔

”چلا گیا ہو۔ ایلی تم ہر وقت اسے کیوں پاس کھڑا کر لیتے ہو۔ خواہ خواہ بھیڑ لگا لیتے ہو۔ کوئی بات بھی نہیں کر سکتا۔“ ایلی چونک کر دیکھتا۔

شہر اونس کر غائب ہو جاتی اور وہ پھر سے اندر چارپائی پر جا بیٹھتا۔

پھر وہ کرسی پر آ جیٹھی اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ دور جیٹھی ہو۔ بہت دور۔ جیسے وہ قریب آ کر بہت دور ہو گئی ہو۔ سائٹھ میل قریب آ کر چھڑا رہا میل چھلا کر میل دور ہو گئی ہو۔

ابھی انہیں اکٹھے رہتے چند دن ہوئے تھے کہ جمال نے اپنا پیارہ گھول لیا۔ وہ ایلی کے پاس آ کر رازدارانہ انداز سے کہنے لگا:

”ایسا کچھ کرنا ہی پڑتے گا ورنہ یہاں اپنی زندگی کیسے بسر ہوگی۔ دن کیسے کٹھیں گے۔“

”زندگی! ای میل کو اس کی بات ہن کر حیرت ہوئی۔“ زندگی تو گزر رہی ہے۔ اس نے

سوچا۔ ”زندگی گزرنے میں وقت کیسی؟“ رجاء نے جمال کیا کہہ رہا تھا۔

”یہاں کس مصیبت میں آپے ہیں؟“ جمال نے ہاتھ بھر کر کھجاتے ہوئے کہا۔

”ہر دوسرے دن کے بعد اس کا خط آ جاتا ہے اور پھر ٹرک کھولتا ہوں تو ہر چیز سے ان کی

یادیں وابستہ ہیں۔ اس کا تضمین رومال ہے۔ آزار بند ہے۔ اس کا ایک دوپٹہ بھگی میں

اٹھالا یا تھا۔ زردگی اٹھالا یا تھا۔ وہ چیتی رہی اے ہے میرا دوپٹہ لیوں لے جا رہے ہو

وہ ایسی کوائیں صندوق کے یاں لے گیا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے ریشمی رومال کھولتے ہوئے کہا: ”اے سونگھونا ذرا۔ کیس بھینی خوبصوراتی ہے اور یہ دیکھو یہ اس کا کلپ ہے۔ سالی کلپ پہنچتی ہے۔ گاؤں والوں سے چوری جوری۔ کوئی دیکھ لے تو نہ جانے کیا فتوے صادر کر دے اس لئے رات کو سونے کے وقت پہنچتی ہے اور صبح اتار کر رکھ دیتی ہے۔ کہ کوئی دیکھنے لے اور یہ دیکھو یہ اس کی خط ہیں۔ ایک دو تین۔ یہاں آئے ابھی دس دن ہوئے ہیں اور دس دنوں میں تین خط لکھے ہیں اس نے۔۔۔ ارے نہ نہ نہ۔۔۔“ ”ایلی کو خط کھولتے دیکھ کروہ چلایا۔۔۔“ ”نہ یار

پڑھنا نہیں۔ یہ پرائیویٹ خط ہیں۔ آج تک ایک دن کے لئے مجھ سے جد نہیں ہوئی تھی۔ اب بیٹھی روتی ہے۔ ہر خط میں لکھتی ہے کسی اور کے پاس نہ جانا۔ بھلا پوچھو۔ یہاں کوئی ہوتا جاؤں نا۔ اس نے شدت سے جسم کھجا یا اور پھر تمہے بند جھاڑنے لگا۔

”تو بے کتنی گرمی ہے۔“

ریاضت کے آنے پر جمال خاموش ہو گیا اس نے ایلی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ٹرینگ میں رکھی ہوئی چیزوں کو سنوارنے لگا۔ پھر اس نے ایلی کے ہاتھ میں ایک تصویر تھما دی!

”یہ دیکھو۔“ وہ زیریں بولا ہے اس کی تصویر یہ ہے۔ سالی ہر وقت اپنی ہاتھ لکالے رکھتی ہے۔ وہ ایک عامی جوان لڑکی تھی۔ چہرہ کوں تھا جس پر دوڑے ہڑے ابھر ہوئے رخسار تھے اور دو گول آنکھیں۔ ناک بیٹھی ہوئی تھی یا شاید اس لہے کہ منہ گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ ناک بیٹھی بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہونٹ موٹے تھے اور آنکھوں کے قریب یوں لکیریں پڑی ہوئی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ ابھی نہ پڑے گی۔ یا جیسے نہیں ضبط کر کے بیٹھی ہوا اور ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جارہا ہو۔

”اچھی ہے؟“ جمال نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ایلی نے تکلفاً کہا ”اچھی ہے۔“

حالانکہ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ محض گوشت کا ایک لوٹھرا ہو۔ جوانی اور صحت کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں ایلی کو بھر پور جوانی اور بھرے بھرے جسم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے کتابی چہروں سے لگاؤ تھا۔ ایسے چہروں سے جن پر گوشت نہ ہو۔ آنکھیں کشمکشیوں کی طرح ڈلتی ہوں۔ ہونٹ خم آلو دھوں۔ آنکھوں میں چمک ہو۔

”باہر چلو۔“ جمال نے آہستہ سے کہا ”یہاں بات نہ ہو سکے گی۔“ اس نے ریاضت کی طرف اشارہ کیا۔ ”باہر برآمدے میں کھڑے ہوں گے۔ آؤ۔“

برآمدے میں جا کر اس نے ایک ہاتھ میں وہ تصویر پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ سے کھانے لگا۔ دیر تک وہ تصویر کو گھوڑتا اور کھجاتا رہا۔ پھر جوش میں کہنے لگا:-

”میرے بغیر چین نہیں پڑتا اسے دو منٹ کے لئے بھی اوہرا دھر ہو جاؤں تو ڈھونڈتی پھرے گی جیسے کچھ کھو گیا ہو اور چاہے کہیں بیٹھا ہوں آگرائیسی شرارت کرے گی۔ چوری چوری چلکی بھرے گی دایسی چھیڑ خانی کرے گی کہ کسی اور گوپتہ نہ چلے لیکن اپنی حالت غیر ہو جا ہے اور پھر جب اپنا بس چلتا ہے تو کن کن کر بدالے لیتا ہوں۔“ اس نے تھہ بند جھاڑتے ہوئے کہا۔

اس وقت جمال کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں کولوں کی طرح دلک رہی تھیں اور وہ دیوانہوار کھجائے جا رہا تھا۔

”اب ہمارا گزارہ کیسے ہو گا یہاں۔ وہ چلانے لگا۔

”وہ دیکھو۔“ اس نے شراب والی کوٹھی میں نامیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ”حرابی یوں کھڑے ہیں جیستا ک لگائے ہوئے ہوں۔ نہ جانے کس تاک میں ہیں۔ نہ جانے ان کا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔ بند کہیں کے دیکھو تو کیسے منہ بناتے ہیں۔ وہ سن۔ تم نے سالے چیخ رہے ہیں۔ آنکھیں مٹکا رہے ہیں۔ یار میں ابھی آیا۔“ جمال نے چیخ کر کہا ”ورا انہیں قریب سے دیکھوں،“ یہ کہتے ہوئے وہ دیوانہوار سیرھیاں اترنے لگا۔

اس کے جانے کے بعد ایلی برآمدے میں کھڑا سوچتا رہا۔ اسے جمال اور ان نامیوں میں ایک عجیب سے مناسبت دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے بال بھی منہرے تھے۔ ان کا رنگ بھی گورا تھا۔ ان کے قد بھی لمبے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے بھی زندگی گز رانا مشکل ہو رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ کھجاتے نہیں تھے۔

نہ جانے وہ لڑکی کون تھی جو خالص گوشت کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔

وہ جمال کو دیکھ کر رشک محسوس کیا کرتا تھا۔ کس قدر حسین جوان تھا وہ جیسے سانچے میں ڈھلا ہو۔ اس کا رنگ صرف سیدھی نہیں تھا بلکہ اس میں سرخی کی آمیزش تھی جیسے گلابی رنگ میں نہرے کی جمال ہوا اور اس کے بال کتنے حسین تھے اور ان میں وہ ہلکا سا گھنگھر یا لہ پن اور وہ دور سے کس قدر حمکتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ اس کا مردانہ جوش۔ جب وہ کھجاتے ہوئے بیٹھے کہہ کر شانے ہلاتا تھا تو ایسی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دھکا دے کر برآمدے کے ستون کو گرا سکتا ہے اور جب جمال نے اس لڑکی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے کہا تھا:

”اور پھر جب اپنا بس چلتا ہے تو گن گن کرنے کا بدلتے لیتا ہوں۔“

اس وقت اس کے چہرے پر بحیرہ و حشت اکبر آئی تھی جیسے واقعی گن گن کر بدلتے رہا ہو۔ اس وقت ایسی کو دکھ محسوس ہوا تھا۔ کاش وہ بھی گن گن کر بدلتے سکتا۔ کاش وہ بھی دیوانہ وار بھپٹ سکتا۔ اس کے خیال میں مرد انگلی دیوانہ وار جھپٹنے کی صلاحیت کا نام تھا۔ نہ جانے کیوں مکرا ایسی کے دل میں یہ خیال جا گزیں ہو چکا ہوا تھا کہ عورت صرف اس مرد سے محبت کرتی ہے اور صرف اسی کی عزت کرتی ہے جس میں جھپٹنے کی صلاحیت ہو۔ ایسا جھپٹنا جس میں بے رحمی اور تشدد کی جھلک ہو۔ اسے علی احمد پر بھی یہی گلہ تھا کہ اس میں جھپٹنے کی صلاحیت نہ تھی اور وہ صرف ٹین کا پاہی بننا جانتے تھے اور جھوٹ موث کی لڑائی لڑ کر اپنا کھویا ہوا تقار حاصل کرنے کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے اور اس سعی لا حاصل سے الٹا رہا۔

ایسی کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ خصوصی قسم کی عورتیں علی احمد کی طرف کھٹھی آتی تھیں۔ علی احمد میں ایک بے نام کشش تھی جس کی وجہ سے عورت ان کی جانب آنے پر خود کو مجبور پاتی تھی۔ ایسی اسرار کو نہ سمجھ سکا تھا کہ آخر علی احمد میں وہ کیا خصوصیت تھی جوان کی بے پناہ کشش کی ذمہ دار تھی۔ ان کے خدوخال میں کوئی خصوصی بات نہ تھی۔ ان کے انداز میں کوئی کشش نہ تھی۔ ان کی باتیں بے حد و لچسپ ہوتی تھیں لیکن باتیں تو قرب

حاصل ہونے کے بعد اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ دور سے کھینچ کر قریب نہیں لاسکتیں۔ اب البتہ ایلی کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ عورت کو اپنی طرف متوبہ کرنا ایک بات ہے لیکن اسے اپنے زیر اثر رکھنا دوسرا بات۔۔۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ علی احمد میں عورت کے لئے کشش تو ہے لیکن وہ اسے اپنے اثر میں برخٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس کا اندازہ تھا کہ وہ ان کے کردار میں مردانگی کو خلی نہ تھا۔ ان میں وہ جھپٹ نہ تھی۔

جمال کو دیکھ کر وہ اس جھپٹ کا اندازہ لگاتا تھا۔ جمال میں کس قدر افطراب تھا۔

جب اس نے ایلی سے کہا تھا:

”یوں زندگی کیسے لے لے گی؟“

تو اس نے محسوس کیا تھا کہ جیسے جمال میں بے پناہ طاقت اپنا اظہار کرنے کے لئے محفوظ ہو۔

ان وقت اسے شہزادی بند بیٹھ کا خیال آگیا۔ اس روز وہ کتنے جوش و خروش سے اٹھ کر وہاں گیا تھا۔ کس قدر حود ساختہ دیواںگی سے اس نے جھپٹنے کی کوشش کی تھی۔ شہزادی منتوف نے گویا اسے اور ابھارا تھا مگر۔۔۔۔۔ ایلی کی آنکھوں تلنے اندر ہیرا آگیا۔۔۔۔۔ اس نے وہ بیتی ہوئی بے عزتی پھر سے شدت سے محسوس کی۔ اور پھر حسرت و تحسین بھری نظروں سے جمال کی طرف دیکھا جو بالکوں کے ستون کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہوئے یوں کھڑا تھا جیسے ایک ہی جھنکا دینے سے وہ بھاری ستون ٹوٹ کر دو حصے ہو جائے گا۔

دیر تک وہ برآمدے میں کھڑا سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ شام کی شفقت اندر ہیرے میں تبدیل ہو گئی اور منجمی منجمی بتیاں ٹھمانے لگیں۔

فری پاس

سیڑھیوں میں قدموں کی آوازن کر ایلی چونکا جمال فاتحانہ انداز سے برآمد ہوا۔

”ارے“ جمال نے ایلی کے گرد اپنے بازو جمائل کر دیئے ”علی“، اس نے ایک نعرہ بلند کیا

”ایلی کمال ہو گیا“، وہ چلایا ”حد ہو گی ایلی حد ہو گئی۔“

جو شہر میں وہ پاگل ہو رہا تھا جیسے بیٹھے بٹھائے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ ”میں نے کہا ایسا کمال ہو گیا ہم بھی پاگل رہے پاگل“ وہ اسے دو ہتر مار کر بولا ”بے وقوف بے وقوف“ اس نے قہقہہ مارا اور پھر کھجاتے ہوئے بولا ”کنوئیں کے کنارے پر بیٹھ کر ہم پانی کو ترستے رہے ہیں۔ کوئی اتنا بڑا الحمق حدا ہو گئی۔ ایسا حد ہو گئی۔ ہم ایک تلاش کر رہے تھے اور وہاں ایک نہیں پائیں پائیں جسے ہیں پوری پائیں پائیں چھ۔ بہت اعلیٰ قسم کی چیزیں ہیں صرف گزارہ نہیں اور گزارہ کہاں یا راکیک کوتو میں ہو دد کیکھ کر آیا ہوں۔ سماں کا جسم یوں تھا جیسے چکنی مٹی کا بنا ہوا اور زرودگی جیسے بستت بہار آئی ہوئی ہو۔ یا رحد ہوئی۔“

ایسا کو جمال کی باتیں سمجھنیں نہیں آ رہی تھیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سامنے کوئی سے پی کر آیا ہو۔ یوں بے کار میں قسم کی باتیں کرنا اور پھر دو ہتر چلانا اور نظرے لگانا۔ اس کی ہربات شرابی سی تھی۔ ایسا یہ ایک بار اس کے منہ کو سونگھنے کی کوشش کی لیکن بونا آئی۔ اس وجہ سے ان کی حیرانگی اور بھی بڑھ گئی۔

”نه جانے کیا کہہ رہے ہو؟“ ایسا نے جمال سے کہا ”میری سمجھ میں آیا کچھ بھی ضرور تم پی کر آ رہے ہو۔“

”لا حول ولا قوۃ جمال گویا دفعتا ہوش میں آ گیا“ ایسا کام کبھی نہیں کیا میں نے لیکن“ وہ پھر بد مست ہو گیا۔ ”سمجھ لو پی کر رہی آیا ہوں۔ شراب نہیں پی۔ لیکن سمجھ لو پی کر آیا ہوں۔ بند بوقل تو نہ تھی پر بڑی نیشاں تھی۔“ وہ چلایا ”سمجھ لو کمال ہو گیا۔ آؤ میں تمہیں سارا واقعہ سناؤں۔“ وہ ایسا کو گھسینے لگا۔ ”یہاں نہیں یہاں بات کی تو ریاضت سن لے گا۔ کوئی بات کرو اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ وہ رک کر جسم کھجانے لگا اور پھر بولا۔

”ویسے یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے بھس بھرا ہو مجھے نہیں اچھا لگتا۔“

جمال اسے کھینچ کر نیچے سڑک پر لے گیا۔ ”وہ دیکھو۔“ اس نے اشارہ کر کے کہا ”ہوٹل کا نیجہ ہتل رہا ہے میں بھی سوچتا تھا کہ یہ کس قسم کا بزرگ ہے کہ کوئی گاہک آتا نہیں ویسے سالا ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔ اب تو میرا دوست بن گیا ہے۔“ وہ رک گیا۔

”سلام علیکم“ ہوٹل کے نیجرنے پاس سے گزرتے ہوئے ہے کہا جمال نے نہ کراس کی طرف دیکھا۔

نیجرنے لگا ”سیر کر رہے ہیں آپ“ اس نے جمال سے کہا۔

”ہاں ذرا یہاں تک جا رہے ہیں۔“ جمال نے جواب دیا۔

نیجرنے ورنکل کر جمال پھر ہشنے لگا۔ ”اب تو مزے ہو گئے۔ اب زندگی کئے گئے میں۔“

”آخر کچھ پتہ بھی چلے،“ ایلی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو گیا ہے۔“

”میں بھی روز بوچا گرتا تھا،“ جمال نے کہا۔ ”کہ جب موڑ سائکل والا آتا ہے اور چوک میں تو یہ نامی بھاگتے کیوں ہیں؟“

”تو کیا پتہ چلا،“ ایلی نے پوچھا۔

”موڑ سائکل والا ڈنڈا گورا ہے۔“ جمال بولا

”ڈنڈا گورا،“ ایلی نے تعجب سے دہرا�ا۔

”ہاں۔ ان نامیوں کا سار جنٹ ہے وہ، اسے ڈنڈا گورا کہتے ہیں یہ سالے اس پارسی سے شراب پیتے ہیں اور ہوٹل والے نے اپنے ہاں پانچ چھلال بیباں رکھی ہوئی ہیں۔“

”لال بیباں؟“ ایلی نے تعجب سے جمال کی طرف دیکھا۔

”اروہی۔ ہیر امنڈی کی عورتیں اور کون،“ جمال مسکر انے لگا۔

”کیا مطلب؟“ ایلی نے حیرانی سے کہا۔ ”اس ہوٹل میں جو بورڈنگ تلے واقع ہے۔“

”ہاں۔ یہ ہوٹل تو محض بہانہ ہے دراصل نیجرنے کا رو بارہی یہی ہے۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر کیا،“ جمال نہ سا۔ ”میں نے گروں سے کہا میں نے کہا سالو ڈنڈا گورا آہے گا تو بتاؤں گا میں کہ تم بد معاشری کرتے ہو۔ پہلے تو وہ بات کو مذاق میں ٹالتے رہے پھر کہنے لگے

اور تم یہاں کیوں آنا تھم بھی کوala لبی لبی کے لیے آنا ہوں میں۔ ”جمال ہنسنے لگا۔ ”میں نے کہا: ہم رپورٹ کرے گا کہ تم نے گند مچایا ہے یہاں۔ اور ایلی کچھ دیر کے بعد ایک جیب سے چاکیٹ لکالا اور مجھے دیکر کہنے لگا اچھا بنا و نہیں چاکیٹ دیتا ہم تم کو۔ میں نے کہا نہیں سالو چاکیٹ دے کر ڈالتا ہے میں۔ ہم رپورٹ کرے گا ضرور کرے گا۔ پھر وہ بولا کیا لے گا۔ بس میں نے کہا اب چھنسے سالے۔ میں نے کہا ہم کوala لبی لبی کے پاس لے چلو۔ اس پر وہ ہنسنے لگے بہت نہیں بو لے۔ ”اچھاول ول ٹم بھی جانا مانگوا۔ ”پھر ان میں سے دو فیجر کے پاس گئے اور کچھ دیر تک اس سے با تین کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا اور ہوٹل والا مجھے اندر رکھا۔

”ارے ایلی،“ جمال نے تھہ بند جھاؤ کر کہا۔ ”ہماری کامیابی یوں تھا جیسے گا چنی سے بنی ہوئی ہے۔ زرد زرد جیسے زردے کی پلیٹ اتنا لگھا ہوا کہ انکی ہن چھپے واہ واہ اور وہ ہنسنی تھی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔“

”اچھا۔ اچھا،“ ایلی کا حلق بند ہوا جا رہا تھا۔

زردہ

اور جب میں باہر لگا تو فیجر نے سوچا۔ شاید بخشش دے گا۔ میں نے اٹا جھاڑ دی۔ میں نے کہا ”لڑکوں کے بورڈنگ تلنے تم ایسا کام کرتا ہے۔ ہم رپورٹ کریں گے۔ اس پر وہ ڈرگیا اور ملتیں کرنے لگا۔ اور معلوم ہے اس نے کیا کہا۔“

”کیا؟“ ایلی کی آواز بیٹھ چکی تھی۔

کہنے لگا ”نہیں جی رپورٹ نہ کرنا۔ جب جی چاہے آ جایا کرو۔“ اس نے قہقہہ مارا۔ ”یعنی اب ہم کو فری پاس مل گیا ہے اور اس کے پاس ایک نہیں چھ ہیں۔ چھ،“ اس نے تھہ بند کو جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اب مزا آ ہے گا۔ سمجھ لو زندگی بن گئی۔“

”اور اور..... وہڑکی،“ ایلی نے پوچھا

”کون لڑکی؟“

”جس کی تصویریم نے مجھے دکھائی تھی۔“ ایلی نے کہا۔

”گڑکی۔“ جمال نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”اُرے ایلی وہ گڑکی نہیں وہ تو میری بیوی ہے۔ اُرے اس کی کیا باتا ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ مگر یہ زردہ بھی خاصی ہے۔ بڑی اچھی ہے۔“ وہ پھر کھجانے لگا۔ ”آخر چار اس میں گڑکی آمیزش ہے۔ لیکن ایلی اس میں کڑا کا ہے۔ یار کل شام کب پڑے گی۔ دعا مانگو کل شام بھی ہو جائے۔“ وہ ہٹنے لگا۔ ”اور دیکھوایا۔“ اس نے محبت سے ایلی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی لے چلوں گا کسی روز۔ ذرا پہنچے پاؤں جمالوں پھر۔ چلو گے تا۔“

”لا حول ولا قوّة“ ایلی چلایا۔

”کیوں لا حول کی اس میں کیا بات ہے اُرے کیا تم بھی ریاضت کی طرح مولوی ہو۔ ہائیں دکھنے میں تو نظر نہیں آتے۔ اُرے بے قوف یہی تو زندگی ہے۔“

”نه نہ“ ایلی بولا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ تم جایا کرو۔“

”لیکن کیوں؟“ جمال نے پوچھا

”بس میرا جی نہیں چاہتا۔“

ویسے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ زبردستی اسے لے جائے اس کمرے میں بند کر دے اور وہ لال بی بی جس میں گڑکی آمیزش تھی چاروں طرف سے زبردستی اسے کھیر لے جتی کہ فرار کی تمام را ہیں بند ہو جائیں۔۔۔ لیکن وقتاً سے شہزادی کی بند بیٹھ کا خیال آگیا۔۔۔ لال بی بی قہقہہ مار کر بھسی۔۔۔ بس بابو۔۔۔ بس۔۔۔ اس کی آواز میں بلا کی تھی تھی۔۔۔

”نہیں نہیں“ ایلی چلا کر بولا۔ ”میں مجبور ہوں، بالکل مجبور۔“

اگلے روز سارا دن جمال بے تابی سے شام کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب سون غروب ہو گیا اور میکلوڈ روڈ کی بتیاں روشن ہو گئیں تو جمال کھجاتا ہوا ایلی کے پاس آیا۔

”ایلی میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑ بڑھ جائے تو خیال رکھنا۔“

اس کے بعد ان کا یہ معمول ہو گیا۔ سارا دن جمال بڑی بے تابی سے شام کا انتظار

کرتا۔ جوں جوں دن ڈھلتا اس کے کھجانے کی شدت بڑھتی جاتی اور پھر جب شام کا دھند لکا چھا جاتا اور میکلوڈ روڈ پر بتیاں ٹھٹھا نے لگتیں تو جمال کپڑے بدل کر تیار ہو جاتا اور مسکراتا ہوا نیچے اتر جاتا۔ اور ایلی چپکے سے اپنی چارپائی پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اسے وہ محسوس ہوتا جیسے وہ دولت پوری میں ہو۔ اور بلا کی چارپائی اس کے قریب ہو۔ اور پھر بالا کے ہاتھ جنبش میں آ جاتے۔

ایک روز جمال خوشی ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی۔“ وہ چلانے لگا۔ ”ذریبا ہر آ کنا۔ تمہیں کچھ بتاؤ۔ باہر ہر آمدے میں۔“ اس نے ایک ریشمی روپی جیب سے نکالا۔ ”یہ دیکھو۔“ وہ بولا۔ ”لنا خوبصورت ہے، ہے نا۔ یہ اس نے دیا ہے۔“
”کس نے؟“ ایلی نے پوچھا۔
”اسی نے جوز رونگ کی ہے جسے میں پہلے روز ملا تھا۔“ جمال بولا۔
”اچھا۔“

”آج جب میں باہر آئے لگا تو برآمدے میں اس نے مجھے پکڑ لیا۔ کہنے لگی آپ تو ملتے ہی نہیں۔ اچھا میری نشانی تو لیتے جاؤ۔ کیا بتاؤں تمہیں اس کی آنکھوں میں کیا حالم تھا اس وقت جیسے بتیاں روشن ہوں۔ کمخت نے ایسی محبت بھری نظر ڈالی کہ میری ہڈیاں چھٹنے لگیں میں بتاؤں تمہیں۔“ جمال دفعتاً رک گیا۔

”بناونا۔“ ایلی نے کہا

”اے مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔“ جمال نے روپا لہراتے ہوئے کہا۔

”ان کو بھی عشق ہوتا ہے کیا۔“ ایلی نے جیرانی سے پوچھا۔

”تمہیں نہیں معلوم۔“ جمال قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”جب ان کو عشق ہوتا ہے تو مزہ آ جاتا ہے۔ جس سے عشق ہو جائے۔ اپنا آپ بیچ کر اسے دے دیتی ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تمہاری قسم،“ جمال نے چھاتی نکال کر کہا ”ان کے عشق کی کیا بات ہے۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔ یا رکھی تم بھی چلو تمہیں دکھاؤں۔ واقعی زردے کی پلیٹ ہے اتنی مٹھاں ہے اتنا رکھاں ہے کہ حد ہوئی یا رہ۔“ وہ جوش میں کھجانے لگا۔ ”کسی روز جب فیجر ادھر ادھر ہو جائے گا تو میں تمہیں لے چلوں گا۔“ ”تمہیں نہیں،“ ایسا چلا یا۔

”ویسے نہیں۔“ بھمال نے کہا۔ ”یونہی دکھانے کے لیے۔ بڑی پیاری باتیں کرتی ہے وہ اور پھر یہاں نہ لینے دیں۔ مجھ سے کیا لائق کرنا ہے اس نے۔ میں تو فری پاس والا ہوں۔“ وہ بہنے لگا۔

جمال کی باتیں سن کر ایسا خیال آتا کہ کاش وہ بھی فری پاس والا ہوتا۔ اسے بھی کوئی نشانی کے طور پر رومال دیتا۔ لیکن کس برستے پر وہ سوچتا مجھ میں وہ جھپٹ بھی ہو۔ وہ مردانہ جھپٹ، وہ جوش جس کے بغیر عورت کسی کو پیار نہیں کر سکتی۔ پھر اسے شہزاد کا خیال آ جاتا۔

نہ جانے شہزاد کیا کہہ رہی ہوگی۔ نہ جانے شریف وہیں ہے یا جا چکا ہے۔ اکثریف وہیں ہے تو وہ اسے لبھانے میں مصروف ہوگی۔ آخر وہ اس کا خاوند ہے۔

”تمہیں نہیں،“ وہ گھبرا کر چلاتا ”شریف وہاں نہیں ہے۔ وہ تو کب کا جا چکا ہو گا اس کی چھٹی عرصہ دراز سے ختم ہو چکی ہوگی آحر سر کار ان گنت چھٹیاں تو نہیں دیتی اپنے ملاز میں کو کیسے دے سکتی ہے۔ ورنہ کام کیسے چلے۔“ اس خیال پر اس کی تسلیم سی ہو جاتی لیکن پھر اس کے تخلیل میں رضا سونما لیکتے ہوئے آ کر چلاتا۔

”نج.....نج۔“

پھر ارجمند کی آواز سنائی دیتی۔

”ارے اندھے یہ وہ دیوی ہے کہ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ لے اس کا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ تیاگ کر سادھوں جائے۔ واہ واہ کیا جاؤ ہے۔“

پھر شہزادغفور کے ساتھ کوٹھے پڑھنے لگتی۔ ”ہی ہی ہی“ اس کے تکمیل تھے گوئے
اور غفور کی بحدی آواز سنائی دیتی۔ اور پھر فقطاً خاموش چھا جاتی اور خاموشی معنی خیز بن
جاتی۔ اور اس کا مفہوم ایلی کی آنکھوں کے سامنے کئی ایک مظہر پیش کر دیتا۔ جنہیں دیکھ کر
اس پر وہی دیوانگی طاری ہو جاتی۔ وہ یوں کروٹیں بدلتا جیسے دار پر چڑھا ہوا ہو۔ اس وقت
جمال آہستہ سے آواز دیتا۔

”تم جاگ رہے ہو ایلی۔ مجھے بھی نیند نہیں آتی۔ کنجھت کا خیال سونے نہیں دیتا۔ لیکن
تمہیں کیا ہے تمہیں نیند کیوں نہیں آتی۔“
”مجھے تو کچھ بھی نہیں،“ ایلی جواب دیتا۔
”کچھ بھی نہیں پھر بھی نہیں نہیں آتی۔“ جمال آہستا۔ وہ دیکھو ریاضت یوں پڑا ہے
جیسے کل کامرا ہوا ہو۔“

ہنگامہ

ای طرح ان کی زندگی حسن منزل میں گزرتی رہی۔ لیکن ایک روز جب شام کے
وقت ایلی برآمدے میں گھوم رہا تھا اور جمال بن سنور کر نیچے جا چکا تھا تو سڑک پر شور و فل
ہوا۔ بہت سے سپاہیوں نے ہوٹل پر یورش کر دی۔ ایلی کو معلوم نہ تھا کہ آیا جمال ہوٹل میں
ہے یا کہیں اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگر وہ ہوٹل میں ہے تو کس طرح اسے باہر نکال
لانے۔ اسے اس بات کے متعلق بھی علم نہ تھا کہ پولیس کے سپاہی وہاں کیوں کھڑے
تھے۔ اور گورے بھاگ کر پارسی کی کوٹھی میں کیوں داخل ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دریتک وہاں
کھڑا رہا پھر جی کڑا کر کے نیچے اتر اکیونکہ یورڈنگ کے تمام طلبہ برآمدے میں آ کھڑے
ہوئے تھے اور وہاں ایک بھیر لگ گئی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر پہلے تو وہ سپاہیوں کی طرف دیکھتا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا لیکن
ایک سپاہی نے اسے روک دیا۔ ”اوہ ہوں آگے گئے جانے کا حکم بند ہے۔“
وہ ڈر کر رک گیا دریتک وہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ سپاہی مشکوک نگاہوں

سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ گھبرا گیا اور کوپ روڈ پر تکیے کی طرف چل پڑا بھی وہ چار ایک قدم چلا تھا کہ تکیے کے قریب سے جمال نے سر نکالا۔

”ارے ایلی ارے ایلی۔“ وہ آہستہ سے چلا یا ”تم ہو کیا۔“ وہ رک گیا۔

”شکر ہے۔“ جمال بولا ”تم آگئے ہو ارے یار میں تو پھنس گیا۔ اور اکر پولیس کپڑ لیتی تو..... میں غسل خانے میں تھا کہ وہ آگئے۔ میں نے جو شور سناتا تو فوراً پچھوڑاڑے کے دروازے کی طرف سے نکل کر تکیے میں آگیا۔ وہ ادھر تو نہیں آ رہے۔“

”نہیں تو۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ تو ادھر لھڑے ہیں۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“

”یار حد ہو گئی پولیس نے ریکارڈ کروی شکر ہے پھر لیا میں۔“

وہ دونوں باہر نکل کر دیاں بڑک پر یوں ٹھیک ہون گئے جیسے اتفاقاً قاتیں کرتے کرتے ادھر آنکھیں ہوں۔

اس ڈر کے مارے کہ کہیں پولیس بورڈنگ میں آ کر تفتیش نہ شروع کر دے وہ دیر تک آوارہ گردی کرتے رہے۔ اور آخر تھک ہار کر اپنے کمرے میں جا پہنچے اور اپنی اپنی چار پائی پر پڑ کر لیٹ گئے۔

اگلے روز کانج جاتے ہوئے انہوں نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ وہاں تالہ پڑا ہوا تھا۔

”ارے“ جمال چلا یا۔ ”یہ لوگ کہاں چلے گئے۔“

”جہاں سے آ ہے تھے وہیں چلے گئے بابو۔ اور کہاں جائیں گے۔“ گندیری والے نے کہا۔

”کہاں“ جمال نے پوچھا۔

”وہیں ہیرامنڈی یا موتی بازار میں اور کہاں جائیں گے۔ کبھی دھندا بھی چھٹا ہے۔“ وہ بولا

”اور یہ جگہ؟“ جمال نے پوچھا۔

”یہ جگہ“ گندیری والا ہنسا۔ ”یہ جگہ کسی تیل صابن والے نے لے لی ہے۔ دکان

کھو لے گا یہاں۔“

راستے میں جمال بار بار ایلی سے کہتا۔ ”اب کیا ہو گا ایلی اب ہم کیا کریں گے زردے کی پلیٹ کیسے ملے گی۔ کیا خوب چیز تھی۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس کے گن تو اب کھلنے لگے تھے مجھ پر اب کیا کروں ایلی۔“

وہ بار بار ایلی سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان معاملات میں ایلی سے بڑھ کر کوئی اتحارٹی نہ ہو۔ اور ایلی چیپ چاپ اس کی باتیں سنے جا رہا تھا۔ وہ حقیقت اسے خود دکھسوں ہو رہا تھا۔ اگر چہ زردہ کو دیکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر بھی امکان تو تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی روز چپکے سے اپنے اتر جائے اور پھر زردہ سے ملنے کے لئے ”خوب نہیں نہیں میرا یہاں آنے سے کوئی مقصد نہیں میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔“

اس وقت ایک زر در گنگ کی نوجوان لڑکی اس کے دوڑوا آ کھڑی ہوتی۔ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے ایلی کی طرف دیکھتی جو صرف اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ پھر اس کی حیرت بھری نگاہیں احساس تحسین سے چھکلتیں اور ایلی دھنماہیر و بن جاتا اور وہ زر در لڑکی اس کی منیتیں کرنے لگتی۔

”لیکن ذرا بیٹھئے تو۔ صرف دیکھنے کے لیے ہے۔ میرے لیے اتنی تکلیف نہ کرو گے۔“

صرف دیکھنے کے لئے اس کے بازو ایلی کے گرد جماں ہو جاتے اس کی آنکھوں میں وہ نگاہ چمکتی وہی نگاہ جس کی وجہ سے وہ شہزاد کو بھول نہ سکتا تھا۔

ہوٹل کے بند ہو جانے کے بعد جمال کی توجہ پھر اسی تصویر پر مرکوز ہو گئی جسے وہ ہوٹل میں جانے سے پہلے دیکھ دیکھ کر وقت گزارا کرتا تھا۔

”آج کوئی خط نہیں آیا ایلی، آج پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اس طرح زندگی کیسے کئے گی میں نے کہا میں دو روز کی رخصت لے کر گھر سے نہ ہواؤں۔ یہاں اب میرا جی نہیں لگتا اور وہ کیا کہے گی کہ گئے ہوئے اتنی دیر ہو چکی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ کیا سمجھے گی۔“

اے کیا معلوم کہ یہاں اس کے بغیر وقت کا نام مشکل ہو رہا ہے۔ ”جمال شدت سے کھجانا شروع کر دیتا۔ ”درachi ایلی مجھے اس سے بہت ہی محبت ہے۔ بے حد۔ اس کے بغیر چنان دو بھر ہو جاتا ہے۔ کیا کروں۔ ”

پھر وہ یکدم پنیرہ بدلتا کر کرتا۔ ”ایلی۔ وہ زردہ کیا کہے گی کہ مجھے بھی نہیں ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ”

”لیکن وہ تو چال گئی ہے یہاں سے۔ ” ایلی نے کہا

”لیکن وہیں گئی ہے تاہم امنڈی میں۔ اسے ڈھونڈنا کیا مشکل ہے۔ یار مجھے اس کا شکر یتو ادا کرنا چاہیے کم از کم۔ ”

”تو پھر، ” ایلی نے پوچھا

”تم ماں تو دونوں چل کر اسے ڈھونڈیں۔ ”

”لیکن ڈھونڈیں گے کیسے۔ ” ایلی نے پوچھا۔

”لو یہ بھی کیا مشکل ہے کیا اس کوچے سے گزرتے جائیں گے اور دیکھتے جائیں گے اگر وہ وہیں ہے تو کھڑکی یا دروازے میں بیٹھی ہو گی۔ چھپ کر تو نہیں پیٹھتیں۔ ان کا تو کام ہی ایسا ہے۔ ”

ایلی کو پسینہ آگیا۔ ”وہ بولا۔ مجھے تو نہ لے کر جاؤ اپنے ساتھ۔ ”

”لو اس میں کیا ہے۔ ” جمال کہنے لگا ”وہاں کوئی اپنا جان پہچان تو ہو گا نہیں پھر ڈر کیما۔ ”

”مجھے تو ڈر آتا ہے۔ ” ایلی نے کہا۔

”تو گپڑی باندھ لینا تاکہ کوئی پہچانے نہیں۔ ”

اس روز وہ دونوں راستے میں اسی بحث میں الجھے رہے۔ ایلی کو اس کے کوچے میں جانے سے ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے جمال اسے زبردستی لے جائے اور وہ جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح پیٹھتی ہیں۔ کس طرح اپنی

اس کوچے میں

ہفتے کو شام ہی نے جمال نے تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ پہلے اس نے ایک طویل عسل کیا پھر رنگ کے پاس بیٹھ کر دیر تک پینے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرتا رہا۔ بالآخر کپڑے پہن کر خوشبو لگائی۔ سترے بالوں کو بڑے انتظام سے بنایا۔ منہ پر کریم کی ماش کی بوٹ چکایا اور پھر یوں تیار ہو بیٹھا جیسے عیاد کی نماز پڑھنے جا رہا ہو۔

شام کے قریب وہ دونوں چل پڑے تھے۔ بھائی دروازے پر وہ تانگے سے اتر گئے تاکہ تانگے والے سے یہ نہ کہنا پڑے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

اس علاقے میں گھومتے گھومتے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کوچہ کہاں واقع ہے۔ جہاں چوباروں میں راگ رنگ کی مخلفیں ہو رہی تھیں۔ ساز سر کیے جا رہے تھے۔ بائیاں تائیں اڑا رہی تھیں لوگ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ کسی سے پوچھئے بغیر اس بازار میں پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس کوچے میں پہنچنا بے حد مشکل تھا۔

دیر تک وہ چکر لگاتے رہے اور اس امر پر بحث کرتے رہے کہ آخر ہو کیسے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔

اس کوچے کے متعلق کسی سے دریافت کرنے کی ان دونوں میں ہمت نہ تھی۔ اور دریافت کیے بغیر وہاں پہنچانا ممکن معلوم ہو رہا تھا۔ آخر تھک کروہ ایک بائی کے چوبارے کے سامنے والے ہوٹل میں چائے پینے کے بھانے بیٹھ گئے لیکن چائے کا پیالہ لے کر وہاں دری تک بیٹھنا آسان نہ تھا۔

”وہاں بھی لوگ بلا تکلف بائیوں کے متعلق باقیں کر رہے تھے۔“

”اس شخصی بائی کے متعلق سنا تھا تم نے استاد۔ کہتے ہیں سیٹھ جمنا داس سے مینڈی کھلوانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”اور بھی اس نے تو بیس ہجار دیا ہے بائی کو مینڈی کھلوانے کے لیے۔“

”کیوں نہ لے بیس ہجار چیز بھی تو غصب کی ہے۔“

”پر گانا وانا نہیں آؤے ہے اُخنی کو۔“

”اجی قدرت بھی حساب سے دیتی ہے۔ کسی کو گلا دیوے ہے تو کسی کو جو بن، کیوں بایو۔“

اس نے جمال کو کہنی مادر کر پوچھا۔

ایلی اور جمال نے دانت نکالے ”ٹھیک ہے میر صاحب۔“

”بس کمالے دو ایک سال پھر وہاں گلی میں جا کر بیٹھ جائے گی۔“ استاد ہنسنے لگا۔
”بازار میں تو اسی کاٹھکانہ رہ سکتا ہے جس کا گلا اچھا ہو۔ کیوں فضلے۔“

فضلے ہنسنے لگا ”ٹھیک ہے استاد۔ گلی میں ہی بیٹھے گی اور کیا۔“

”کونسی گلی میں؟“ ایلی نے فضلے کے قریب ہو کر پوچھا۔

”اجی اسی میں۔“ پھر اس نے غور سے ایلی اور جمال کی طرف دیکھا۔ ”تم پر دیکھی ہو بایو۔“

”ہاں ہاں۔“ جمال بولا۔ ”امر تر سے آئے ہیں۔“

”ہی ہی ہی،“ فضلے ہنسنے لگا جسمی گلی کا پتہ نہیں۔

”پھر بھی کہاں ہے وہ؟“ جمال نے دوبارہ پوچھا۔

”یہ تھانے کے سامنے جو ہے۔ پر بایو یہاں کامال اچھا نہیں۔ بس دو تین ہی کام کی ہیں باقی سب بھرتی کامال ہے۔“

چاۓ ختم کر کے وہ پھر اسی چکر میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اب مشکل حل ہو چکی تھی۔

اب وہ کسی راہ گیر سے پوچھ سکتھے تھے کیوں میاں تھانہ کدھر ہے اس علاقے کا۔
وپھلا ایلی خوشی سے چلایا۔ ”تھانے کا بورڈ تو میں نے پڑھا تھا۔ کسی چوک کے قریب
تھا۔ یا انہیں رہا کس چوک کے قریب تھا۔“

تھانہ تلاش کرنے میں انہیں چند اس وقت نہ ہوئی۔ تھانے پہنچ کر اس گلی کو نہ دیکھنا قطعی
ناممکن تھا کیونکہ بہت سے لوگ ادھر سے آ رہے تھے۔ وہ قیچیہ لگا رہے تھے۔ ایک
دوسرے کو کہیاں مازر ہے تھے۔ انہیں چکار ہے تھے۔ کئی ایک تو با آواز بلند گارہ
تھے۔
وہاں پہنچ کر ایلی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی ہمت نہ پہنچ رہی تھی۔ گلی میں داخل ہو بازار کی
بات اور تھی۔ وہ تو دوسرے مازروں کی طرح ایک عام گزر گاہ تھی۔ وہاں چلتے ہوئے
لوگوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ رنگ یوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں یا انہوں نے
جب بارے میں جانا ہے۔

لیکن اس گلی میں جانا تو اعلانیہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ان عورتوں کے لیے آہے
ہیں۔ ا تو رپھر گانے والیوں کو دیکھایا ان کا گناہ سننا برانہ تھا۔ گلی کی رنگ یوں کو دیکھنا ایلی کی
نالگیں کا چنے لگیں۔ لیکن اتنی دور آنے کے بعد اب گلی میں جانے سے انکار کرنا بھی تو ٹھیک
نہ تھا۔

”میں کہتا ہوں۔“ اس نے جمال سے کہا۔ ”میں اندر جا کر کیا کروں گا۔ تم جا کرے
مل لو۔ میں تمہارا یہاں انتظار کروں گا۔ اسی جگہ۔“

”نہیں یا ر۔“ جمال نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا ”ا کٹھے چلتے ہیں۔“

”لیکن“ ایلی نے کہا۔ ”اگر وہ مل گئی تو میں وہاں کیسے انتظار کروں گا۔“

”ہاں۔“ جمال سوچ میں پڑ گیا۔ ”مل گئی۔“ اس نے کہا ”تم پھر تم یہاں آ کر انتظار
کرنا۔ چلو نا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر لے چلا۔

گلی میں بے حد ہجوم تھا لوگ قیچیہ لگا رہے تھے۔ بھوٹے مذاق کر رہے تھے۔

رندیوں سے بحث کر رہے تھے۔ انہیں چھپیر رہے تھے۔ یوں نہ کر باقیں کر رہے تھے جیسے وہ رندیاں ہی نہ ہوں۔ ایلی یوں جمال کے ساتھ چل رہا تھا جیسے اسے گلی سے قطعی طور پر کوئی ڈچپی نہ ہو۔ جیسے وہ وہاں زبردستی لایا گیا ہو۔ ہر راہ گیر کی طرف وہ کچھ اس انداز سے دیکھتا جیسے اسے ذہن نشین کر رہا ہو کہ میں تو ویسے ہی آیا ہوں ان کے ساتھ ڈچپی تو صرف انہیں ہے مجھے نہیں۔

خود جمال وہاں پہنچ کر بھول چکا تھا کہ وہ دو گھنٹے کی تیاری کے بعد آیا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس نے بچ کر پڑے زیب تن کیے ہوئے ہیں اور ان پر خوشبو لاگار کھی ہے اسے وہ دونوں رسمیں رومانی ہی یاد نہ رہے تھے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ دراصل وہ بے حد گھبرا یا ہوا تھا۔ ان کی گروپن جگہ ہوئی تھی۔ اور زگا ہوں میں گھبراہٹ تھی۔

کافی دیر تک تو ایلی نے آنکھیں اٹھا کر ان بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تو اس نے ایک سرسری تحقیر بھری نگاہ رندیوں پر ڈالی۔ انہیں دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا۔ لا حول ولا قوہ اس نے زیر لب کہا۔

اس شگ و تاریک بل کھاتی ہوئی گلی میں وہ لاثینیوں کی بیتوں کے نیچے بن سنور کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے مویشیوں کی میلے میں بھینیں دیکھ رہا ہو۔ ان کی جوانیاں اٹی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوچ رہی تھیں۔ ہونٹ یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے جونکیں ہوں۔ چہروں پر تھا ہوا پاؤڑا اور سرخی انہیں اور بھی بھیا نک بنارہا تھا۔ ایلی نے جھر جھری لی۔ وہ بازار حسن نہیں تھا بلکہ سڑے ہوئے بدبو دار گوشت کی منڈی تھی۔

رندیوں کے چہروں پر تروتازگی اور معصومیت نہ تھی۔ بلکہ حزن و ملاں اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی حرکات بھونڈتی تھیں۔ آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے پھٹے ہوئے بانس نج رہے ہوں اور وہ اعلانیہ لوگوں کو بیارہی تھیں۔ یا یوں بازو والٹھا تیں جیسے کسی کو گلے

لگنے کی خواہش میں بے قرار ہو رہی ہوں۔ ایک انگڑا ایسا لیے جا رہی تھی۔ لیکن اس کی انگڑا ایسوں میں اکتا ہٹ اور حسرت تھی۔ دوسری روئی میں کچھ گلنگا رہی تھی۔ اس کا گیت دکھ بھرا تھا۔ زیادہ تر عورتیں چپ چاپ بیٹھی انتظار کر رہی تھیں کہ کب کوئی آ کران سے سودا کرے۔

مردوں کے گروہ ان کے سامنے کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔ ان کے جسموں کو ٹھوٹ رہے تھے ان کے ناک نقشے پر پھیتیاں اڑا رہے تھے۔ ان کی عمروں کے متعلق اندازے لگا رہے تھے اور ان سے خشن مذاق کر رہے تھے۔ وہ ان کی باعثیں بتتی تھیں لیکن انہیں ان سنی کر دینے پر مجبور تھیں۔ وہ ان کی محکمہ خیز نکاحوں کا ہمداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی نکتہ چینی کے جواب میں مسکھانے پر مجبور تھیں۔
فُعَالٍ نے محسوس کیا کہ عورت کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کوئی نہیں ہو سکتی کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے کوہوں، چھاتیوں اور جسم کے ناقص گنیں یا اس کے حسن و جمال یا عمر کے متعلق پھیتیاں اڑائیں۔
پھر وہ وہاں کیوں بیٹھی تھیں۔

اس کا خیال تھا کہ جسمانی ہوں پوری کرنے کے لئے عورتیں اس کے لو میں جا بیٹھتی ہیں۔ جسمانی لذت ”یہ بیچاریاں“ وہ سوچنے لگا ”ان کے چہرے تو دکھ بھرے ہیں۔ ان کے ہونٹ گویا صرف آہیں بھرنے کے لیے بنے ہیں۔ اور ان کے لئے ہوئے اپانے جسم، جسمانی لذت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا اور وہ یہی بیٹھی حقہ پیتی رہی۔

مزدور کے ساتھی نے قہقہہ لگایا۔ ”ماں تیرے پاس کوئی آتا بھی ہے کیا۔“ ”تو ہی آ جائیا جو تجھے اتنا درد ہے میرا۔“ بڑھیا نے نفرت سے کہا۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسے گندگی میں دھکا دے کر گرا دیا ہو۔ اس کا دل ماش کر رہا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور سارے جسم میں جھن جھن سی ہو رہی تھی۔ جیسے اس

کے جسم کا بند بند کراہ رہا ہو۔ اس کے لیے اس کوچے میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جمال سے کہہ دے میں جا رہا ہوں۔ میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

”ایلی ایلی،“ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر کہا ”ایلی وہ مل گئی۔“

ایلی نے مرد کر دیکھا۔ جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ”وہ مل گئی ایلی۔“ اس نے مجھے پہچان لیا ہے اور رومال سے اشارہ کر کے مجھے باراہی ہے۔ وہ دیکھو

”جمال نے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔“ وہ دیکھو جو سرخ تمیض پہنے ہوئے ہے۔ جس کے ہاتھ میں بزر رومال ہے۔ وہ دیکھا وہ مسکرا رہی ہے۔ اپرے وہ چلایا ”لو وہ مجھے بو سے پھینک رہی ہے۔“

ایلی نے اس طرف دیکھا ایک تنگ و تاریک کوٹھری کے دروازے میں سرخ تمیض پہنے ایک دلی پتلی ہورت بیٹھی تھی۔ اس کے گلوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں جھریاں پڑی تھیں اور آنکھیں یوں کھنچی ہوئی تھیں جیسے ان میں بند ہونے کی صلاحیت نہ رہیں ہو۔

”اچھا تو میں چلتا ہوں.....“ وہ بولا۔ ”گلی کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔“

گلی کے باہر انتظار کرتے ہوئے وہ سوچتا رہا لیکن اس میں سوچنے کی صلاحیت نہ رہی تھی۔ شدید نفرت کی وجہ سے اس کے جسم کا بند بند کانپ رہا تھا۔ گلی کے بد صورت چہرے اس کے سامنے تھے۔ ان کے سوچے ہوئے منہ۔ پھٹی پھٹی آنکھیں اور مجرور جسم ایلی کے دل میں نفرت کی دھنگی نج رہی تھی اور یہ نفرت اس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر دیوانہ اور گلی میں جا داخل ہو۔ اور کسی بد صورت ڈائیں کی کوٹھری میں داخل ہو کر کہے میں آگیا ہوں میں آگیا ہوں مجھے اپنی غلاظت سے بھردے۔ مجھے اس گندگی سے شر ابور کر دے۔ میری ہڈیاں توڑ دے، مجھے فنا کر دے۔ اور پھر اس کے غلیظ جسم پر ڈھیر ہو جائے۔

ایلی کے دل میں عجیب متفا خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ کسی وقت اس تضاوک محسوس کر

کے گھبرا جاتا اور اسے خیال آتا کہ اس کی سر شست میں نہ جانے کیا خامی ہے کہ اس کے دل میں بیک وقت ایسی متفاہ خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ بسا وقایت اسے شک پڑتا کہ وہ دیوانگی کا شکار ہے۔

ان خیالات سے بچنے کے لیے دریتک و وہ قہانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ بازار کو غور سے دیکھتا رہا۔ راہ گیروں کو جا بچنے کی کوشش میں شدت سے مصروف رہا۔ لیکن جب وہ ذرا بے خبر ہوتا تو ان کی نگاہ کے تلے اسی گلی کے چہرے نمودار ہو جاتے ان کی کریہہ مسکراہیں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کے تباہ شدہ لئے ہوئے جسم اس کی طرف بڑھتے دل میں نفرت کی ونکلی بجنا شروع ہوا جاتی۔ اور پھر وہی دیوانہ پن اس پر مسلط و محیط ہو جاتا۔

”کس خیال میں پڑے ہو، جمال نے اس کے قریب آ کر اسے چھین گوا۔ ” سنتہ ہی نہیں،“

”اوہ تم آ گئے“ وہ چونکا۔ ”مل آئے زردہ سے“ اس نے پوچھا۔
”مارے نہیں وہ تو کوئی اور ہی نکلی لیکن اچھی تھی بیچاری۔ اتنی اچھی تھی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں کہتی تھی مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ ایمان سے یہی کہتی تھی دیکھتے ہی پیار ہو گیا اور اس قدر شوق محسوس کیا میں نے کہ اگر تم اشارے سے نہ آتے تو خود آ کر تمہارا ہاتھ پکڑ لیتی۔“

ایلی نے حیرانی سے جمال کی طرف دیکھا۔ خوش قسمت تھا وہ جو بھی اسے دیکھتی تھی اسے پیار کرنے لگتی تھی۔ کاش ایلی نے آہ بھری۔

راستے میں جمال اسے اپنے اس نئے عشق کے قصے سنارہا تھا۔ تفصیلات بتا رہا تھا لیکن ایلی اپنے ہی خیالات میں مگن چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جمال میں کون سی بات ہے جس کی وجہ سے وہ اس سے عشق کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس میں بھی وہ مردانہ جھپٹ ہوتی۔ کاش۔

چار ایک روز کے بعد جمال بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی!“ اس نے متذکر انہیں اندراز سے کہا ”یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔

”کیا ہو گیا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے ٹینٹ پٹانی ہے اور میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو وہ کہتا ہے کہ تمہیں بیماری ہو گئی ہے۔“

”بیماری کوئی بیماری“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ بیماری“ جمال بولا۔ اس کے چہرے پر تشویش کا اظہار ہوا تھا۔ ”اگر میں یہاں رہتا تو تمام لڑکوں کو معلوم ہو جائے گا۔ مجھے سے چلا جو نہیں جاتا۔ اس لیے میں گاؤں جا رہا ہوں۔“

”گاؤں جا رہے ہو؟“

”ہاں ہاں“ وہ بولا۔ ”اس کے سواب کوئی چارہ نہیں مجھے جان ہی ہو گا“ یہ کہہ کر اس نے ایلی کے ہاتھ میں چھٹی کی عرضی تھماوی۔ اور بات کی وضاحت کیے بغیر اپنے ٹرنک میں کپڑے قرینے سے رکھنے لگا۔

”لیکن“ ایلی نے کہا ”آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ گے بھی یا ر۔“

”ابھی اس نے جملہ مکمل نہ کیا تھا کہ دیا ضت داخل ہوا اور جمال نے اشارہ کر کے ایلی کو خاموش کر دیا۔“

اوٹ میں شانتی

جمال کے جانے کے بعد ایلی بالکل ہی تنہارہ گیا۔ وہ پہر تک وہ کالج میں وقت کا تھا۔ اگر چوہ جماعت میں چلا جاتا تھا لیکن ابھی تک اس نے ہم جماعتوں سے کوئی رسم و رواہ پیدا نہ کی تھی۔ اکیلا ہر آدموں میں گھومتار ہتا خالی پیغمبر یہ میں یا تو باہر لان میں ٹھہلتا اور یا بازار کی طرف نکل جاتا اور ان مقامات پر جانے سے احتراز کرتا جہاں کالج کے لئے جمع ہوتے۔

جماعت میں وہ آخری بچوں میں بیٹھے جاتا اور جب پروفیسر لیکچر شروع کر دیتا تو وہ کسی قد آور لڑکے کے پیچھے ہو کر تخلیقات کی دنیا میں کھو جاتا۔

الگش ڈرامہ پڑھانے والے پروفیسر کی موچھوں سے اسے ڈر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ محسوس کیا کرتا تھا کہ کسی مدرسے کے ماسٹر نے پروفیسر کا چغاپکان رکھا ہو۔ اس لیے ڈرامے کے پیروی میں ایلی بیٹھنے کے لیے خاص طور پر ایسے مقامات تلاش کرتا تھا جہاں پروفیسر کی نگاہ نہ پڑے۔ ڈرامہ کے پروفیسر کے پڑھانے کا انداز بھی تو عجیب تھا۔ سبق کی ابتداء میں تو پروفیسر کی طرح بات شروع کرتا۔ پھر بتدریج جوں جوں وقت گزرتا پڑھانے کے باوجود پلیٹ فارم پر ڈرامہ خلیانا شروع کر دیتا۔

وہ ایکٹروں کی طرح با تحریک چلاتا۔ منہ بنتا۔ پروفیسر کو ایکٹر کرتے دیکھ کر اسے علی پور کا وہ فراغ صحن یاد آ جاتا جہاں انہوں نے ڈرامہ لکھا تھا اور پھر سافوری اس کے سامنے آ بیٹھتی اور زیک اسے دیکھ کر جوش میں آ جاتا اور اپنا ڈنڈا بے پرواہی سے گھماتا اور سچ پر کھڑے دیگرا یکٹر زیریں چلاتے۔ ”ابے خیال سے بے کہیں زخمی نہ کر دینا کسی کو۔“ اور ناظرین زیک کی بھونڈی حرکات کو دیکھ کر تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کاشور مجھ جاتا۔

یا ایلی کو امر تسری آم والی کوٹھی یاد آ جاتی اور نورا پنی تمام تر رعنائی سے ٹھلتے ہوئے گانے لگتا پھر شبھگن سے بھار آ جاتی۔ ندی کا پانی رک جاتا اور ندی ایک وسیع نیالی جھیل میں تبدیل ہو جاتی اور رختوں پر کوئی کوتی۔ کھیتوں میں سرسوں لہلہتی اور آصف مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا اور آہ بھر کر کہتا آ جاؤں ایلی یہاں شبھگن ہے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ جب وہ جماعت میں اپنے تخلیل میں کھویا ہوتا تھا تو اس کے ساتھی نے اس جنگجو ڈر جگا دیا تھا کہ جماعت کے تمام لڑکوں کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں اور موچھوں والا ایکٹر پروفیسر اس پر پھیتیاں کس رہا تھا۔

اکنامکس کے پیروی میں ایسا حادثہ ہر لمحہ ہوا تھا۔ اسی لیے اکنامکس کے پیروی میں کبھی کسی کا ڈرم محسوس نہ ہوا تھا۔ اکنامکس کے پروفیسر ہر لمحہ سے انگینڈریٹر نڈ قسم کی طبیعت

کے مالک تھے۔ اگرچہ انگلستان سے ڈگری لے کر واپس آ چکے تھے۔ مگر ذہنی طور پر وہ ہمیشہ کے لیے انگلستان ہی میں مقیم ہو چکے تھے۔ وہ خوبصورت لباس پہن کر جماعت میں داخل ہوتے تھے۔ اور آتے ہی رجسٹر کھول کر حاضری لگانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ حاضری لگاتے وقت انہوں نے بھی سر اٹھا کر اڑکوں کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اڑکے لیں سر کہنے کے بعد جماعت سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ آیا اڑکے ان کے پیرویہ میں حاضر رہنا چاہتے ہیں یا بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ اما وہ بھانگنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے قائل تھے۔ انہیں اس کی بھی فکر نہ تھی کہ آیا اڑکے ان نے پیکھر کو سمجھ رہے ہیں یا نہیں۔ آیا وہ اسے سمجھنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان کا اندازہ مالک پروفسر ان تھا باقی پروفیسر تو یوں بات بات پر کان کھڑے کرنے کے عادی تھے جیسے سکول مائزہ ہوں۔

بہر حال ایلی جماعت میں ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ حاضری لگوا کر بھاگتا نہیں تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے تعلیم سے دلچسپی تھی یا پیکھر سننے کی خواہش تھی بلکہ صرف اس لیے کہ جماعت کے باہر کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ بیٹھ سکتا ہو۔ جہاں اسے کالج کے اڑکوں سے پناہ مل سکتی ہو۔ جماعت کا کونہ اس کے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔ جہاں وہ اپنے تخيیل سے کھیل سکتا تھا۔

کالج میں وہ ایک گمنام اڑکا تھا۔ حتیٰ کہ جماعت کے پروفیسر اور اڑکے اس سے واقف نہ تھے اکر تھے بھی تو سری طور پر جب وہ ایلی کی طرف دیکھتے تو ان کی نگاہ میں تحقیر بھری ہوتی جسے محسوس کر کے ایلی کو ایک جھنکا سالگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے۔ ان تمسخر بھری کریدتی ہوئی نگاہوں سے دور بھاگ جائے اور پھر چشم سے شہزاد اس کے روپ و آکھڑی ہوتی اور اپنی دونوں بانہیں اٹھاتی اور وہ اس کی آغوش میں گر جاتا۔ ان دونوں حسن منزل کے قریب کالج والے ایک نیا یورڈ نگ تعمیر کر رہے تھے جس میں صرف کیوں بیکل بننے ہوئے تھے۔ یہ خبر عام تھی کہ حسن منزل کو خالی کر دیا جائے گا اور

حسن منزہ کے لڑکوں کو ریواز یا نئے بورڈنگ میں جگہ دی جائے گی۔ جو کانج کی عمارت کے ساتھ ملحت تھے۔ یہ خبر ایلی کے لیے بڑی پیشان کن تھی کیونکہ ایلی کو حسن منزل کی تہائی اور خاموشی بے حد پسند تھی۔ وہ ریواز ہوٹل میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں لڑکے بے حد ہنگامہ پسند تھے۔

ایلی کی خواہش تھی کہ اسے ایک کمرہ مل جائے جہاں وہ تہائی میں اطمینان سے رہ سکے لیکن الگ کمرہ ملنا آسمان نہ تھا۔ نئے ہوٹل کے کیوں بکل خصوصی طور پر سینئر اور فور تھا ایئر کے لڑکوں کے لیے بنائے گئے تھے ایلی تو تھرڈ ایئر میں تھا اس کے لیے کیوں بکل حاصل کرنا اتفاق پیدا ناممکن تھا۔ اور پیر یوسف اعظم سے جو کانج کے نئے پروپریٹر بن کر آئے تھے اور جنہوں نے آتے ہی نظم وقت کی وجہ سے کانج میں پانی و صاک بخادی تھی۔

ایک روز جب ایلی اپنے گمرے میں بیجا جمال کی اس عجیب و غریب بیماری کے متعلق سوچ رہا تھا جو ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے اس نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی مانگی تھی تو ریاضت فاتحانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوا۔ آتے ہی کہنے لگا۔
”میں نئے ہوٹل جا رہا ہوں۔ مجھے وہاں ایک کمرہ مل گیا ہے۔“

”نئے ہوٹل میں،“ ایلی نے جیرانی سے پوچھا۔ ”تھرڈ ایئر کو نئے ہوٹل میں کس طرح کمرہ مل گیا۔“

ایلی نے جیرانی سے ریاضت کی بات سنی۔ شور و شغب سے قبض، یہ بات اس کے لیے انوکھی تھی۔ سارا دن وہ سوچتا رہا کہ وہ ابھی ایسا ہی کوئی بہانہ تراش لے تو شاید اسے بھی نئے ہوٹل میں جگہ مل جائے اور وہ ریواز ہوٹل میں جانے سے بچ جائے۔

واٹ ناسن

دوروز کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نے ایک عرضی لکھی جس میں درج تھا کہ میں ڈنی انتشار کا مریض ہوں اور شور و شغب میں تعلیم کی طرف توجہ دینے سے معدود ہوں۔ لہذا ازراہ کرم مجھے ایک کیوبکل میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

عرضی ہاتھ میں پکڑے وہ دریتک پر پل کے چپڑاں کے ساتھ دفتر کے باہر بیٹھا رہا۔ پھر پرپل نے اسے بلایا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مودبانہ سلام کیا اور عرضی پرپل کے سامنے رکھ دی۔

”ول ول“ عرضی پڑھ کر پرپل غصے میں بولا۔ ”تم نیوراس کا مریض ہے؟“

”جی ہاں جی ہاں۔“ ایلی نے نیوراس کا مطلب بھے بغیر پلایا۔

”ویل ویل“ پرپل بولا۔ ”تو تمہیں کانج میں کس نے داخل کیا۔ نیوراس کے مریض کا کانج میں کیا کام۔“

”جی جی۔“ ایلی کھرا کیا۔ اسے سمجھنی میں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

”هم تمہیں کانج میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جب تک تم نفس کا سائیکلٹ نہ پیش کرو۔ سمجھا۔“

”جی جی۔“ ایلی کی گھنگھی بندھی ہوئی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ پرپل نے گھورا۔

”جی جی۔ ایلی جی ہاں ایلی۔“

”ایلی۔“ پرپل نے حیرانی سے دو ہر لیا ”یہ کیا نام ہے۔“

”جی نا متوالیاں ہے الیاس ویسے ایلی ایلی کہتے ہیں۔“

اس پر پرپل نہ جانے کیوں ہنسنے لگا۔ ”تم کانج میں پڑھتا ہے۔ اس کانج میں۔“ وہ بولا۔ عین اس وقت چھت کے گارڈر پر بیٹھے ہوئے کبوتر نے بیٹ کی جو پرپل کے سر پر گری۔

”ہے۔“ وہ چلانے لگا۔ ”واٹ نان سینس۔ اے چوکیدار چوکیدار۔“ اس نے گھنٹی بجانی شروع کر دی اور پھر غصے میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ایلی ڈر کر دیوار سے لگ گیا۔ چوکیدار بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔ ”حضور حضور۔“

کھاں تھا تم۔ کھاں تھا۔ واس پرپل کو بلا و۔ واس پرپل کو فوراً۔

چو کیدار باہر بھاگا پر نسل دیوانہ وار کمرے میں گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ چھت کی طرف دیکھتا۔ کبھی اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا وہ مسلسل چلانے جا رہا تھا۔ ”واتنان سنیں دس از آفس آرائے بجن ہول دس از نو خانقاہ۔“ وہ کبوتر کو دیکھ کر کہتا۔

موخچھوں والا پروفسر گھبراہٹ میں داخل ہوا۔
”اے واکس پر نسل پر واث از دس۔ یہ کالج ہے یا خانقاہ ہے۔“

”خانقاہ۔“ واکس پر نسل نتیجہ سے دہرا یا۔
”ول ول وو بھن دیکھو وہ چھت پروہ۔“ اس نے اشارہ کیا۔ ”سی ویٹ اٹ از ریمووڈ۔“

”ابھی ابھی۔ دس از پر نسل روم نان۔“ اس نے چوکیدار اور واکس پر نسل کو مخاطب کر کے کہا چوکیدار باہر سے ایک لمبا بائس لے کر آیا اور واکس پر نسل اور چوکیدار کبوتر کو نکالنے میں مصروف ہو گئے۔“

دنھٹا پر نسل کی نظر ایلی پر پڑی۔ ”ول تم یہاں کیوں ہے۔“
”جی وہ عرضی۔“ ایلی نے کہا۔

”عرضی۔ کیسی عرضی۔“ وہ عرضی کی طرف لپکا۔

”آپ نے کہا تھا۔ آپ نے یعنی۔“ ایلی گھبراہٹ میں بولا۔

”ول ول چھٹی مانگتا ہے۔“

”جی جی یعنی میرا مطلب ہے۔“ ایلی کی گھبراہٹ اور بڑھنی۔

پر نسل نے جیب سے پن نکالا اور عرضی پر کچھ لکھ کر ایلی کے ہاتھ میں عرضی تھما دی۔
ران اوے ران اوے وہ ایلی اور کبوتر سے مخاطب ہو کر چلانے لگا۔

اپنے کمرہ میں پہنچ کر ایلی نے عرضی میز پر پھینک دی۔ اور خود چارپائی پر پڑ گیا نہ جانے اب کیا ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہیں وہ کالج سے نکال دیں۔ اسے پر نسل نے کہہ جو دیا تھا کہ تمہیں کالج میں کس نے داخل کیا تھا۔ لیکن میں یہ عرضی پھاڑ دوں گا مجھے کیا پڑی

ہے کسی کو دکھاؤں یہ عرضی۔

وہ سوچنے لگا کیا کانج کے پرنسپل ایسے ہوتے ہیں اور پھر یوسف اعظم کتنا مشہور آدمی تھی وہ ساری دنیا میں اس کے علم کا چرچا تھا۔ انگریزی کا عالم گنا جاتا تھا۔ کیا بڑے آدمی اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اور وہ یونیورسٹی میں کبھر تراڑاتے ہیں۔

کمرے میں دوسرا جانب ریاضت اپنا سامان الٹھا کر رہا تھا کیونکہ اسی روز وہ نئے بورڈنگ میں جا رہا تھا۔

”یہ کاغذ یہ کاغذ“ اس نے میز سے کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری کاغذ ہے کیا؟“

”پتہ نہیں۔“ ایلی نے اس کی بات صحیح بغیر بولالام

”ارے ہائیں۔“ ریاضت چلایا۔ ”یہ تو تمہاری عرضی ہے۔“

”میری عرضی“ ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”میری عرضی۔ ہاں ارے۔“ اسے یاد آیا۔ ”اسے مجھے دے دو اسے پڑھوئیں یہ تو پرانی بیویٹ کاغذ ہے۔ وہ ریاضت کی طرف لپکا۔“

ریاضت گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”میں نے تو پڑھ لی ہے۔“ وہ بولا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہیں بھی نئے بورڈنگ میں کمرہ دے دیا گیا ہے۔“

”کمرہ دے دیا گیا ہے۔“ ایلی نے حیرت سے ریاضت سے ریاضت کی طرف دیکھا ”کس کو کمرہ دے دیا گیا ہے۔“

”یہ دیکھ لو اس پر جو لکھا ہے۔“ ریاضت نے عرضی اس کی طرف بڑھا دی۔ ایلی نے حیرانی سے عرضی کی طرف دیکھا تھا۔ لیں او کے نیچے پرنسپل کے دخنخڑ جو تھے۔ خوشی سے ایلی کی چیخ نکل گئی۔ ”ارے۔“ وہ قہقہہ مار کر نہس پڑا ارے وہ کبھر اڑانے والا مسخر۔

حدو گئی۔ واثنان سنس وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

ابھی ایلی کو نئے ہوٹل میں کمرہ صرف ایک دن ہوا تھا کہ کانج وہ روز کے لیے بند ہو گیا اور وہ اپنا سوٹ کیس الٹھائے علی پورروانہ ہو گیا۔

جب وہ شیشن پر پہنچا تو وہاں رضا اسے ملا۔

”ارے تم“ رضا نے خوشی سے اپنی ہا کی کی سٹک گھمائی۔ ”تم یہاں کیسے۔“

”چھٹیاں ہو گئی ہیں نا اس لیے آ گیا ہوں۔“

”تو بڑے وقت پر آتا ہے اب تک بڑے وقت پر آتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان شادیوں میں اگر تو نہ آ جائے تو کیا مزا آئے گا۔ بالکل بے کار۔“

”شادیاں۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”کس کی شادی؟“

”ایک ارے باپ وہاں قوپوری چار شادیاں رچی ہیں اپنے محلے میں روزہ ہولک بجتی ہے۔ عورتیں گاتی ہیں میراثیوں کی بیٹھک ہوتی ہیں۔ وہ رنگ جما ہوا ہے محلے میں کہ دیکھو گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ مندر بننا ہوا ہے۔ مندر۔ اور وہ تمہاری۔“ رضا رگ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اور زبان ہوتھوں میں لے لے کہنے لگا۔ ”تو بہے تو بہے۔ وہ تو یقین اس مندر کی دیوی ہے اور ایلی گاتی ہے وہ ہے کیا گاتی ہے کیا گلا پایا ہے اور جو گاتے ہوئے اسے دیکھو تو خدا کی قسم آنکھیں اب ایسی ہیں۔ پاگل ہو جاتا ہے دیکھنے والا چلو۔ محلے میں چلو تو..... لیکن،“ دھڑا رضا رک گیا۔ ”تم تو وہاں جا کر اس کے ہو رہو گے تمہارے لیے تو نیچے اترنا مشکل ہو جائے گا اور ہمارے لیے تمہارا آنا نہ آنا را ہو جائے گا۔“ پاگل ہو گئے ہو۔ ایلی نے جھوٹ موت اسے ڈانگا۔

”تم چاہے ڈانت لو۔ جو جگی میں آئے کہہ لو لیکن،“ رضا کی آنکھیں بھرا ہیں۔ ”اس نے تمہیں ہم سے چھین لیا ہے اور وہ ارجمند وہ بھی نہیں آ رہا ب کی بار“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”یکار ہے کھانسی بڑھ گئی ہے۔ سناء ہے اب تو ہر وقت بخار رہتا ہے۔ وہاں گاؤں میں چار پالی پر پڑا ہے۔“

”رضا،“ ایلی نے اسے کہا۔ ”چلو کبھی وہاں چلیں۔ ارجمند سے مل آئیں۔ تمہیں نہیں معلوم وہ بڑی ملتیں کرتا تھا کہتا تھا۔ وہ ایک بار میرے پاس آؤ صرف ایک بار۔“ ایلی

پر رفت طاری ہو گئی۔ ”کہتا تھا“ اس نے مسکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف یہی حسرت ہے کہ تم اپن کی راجدھانی دیکھنے کے لیے نہ آ ہے۔ کہتا تھا“ اسے بے اختیار بنسی آ گئی۔ ”گاؤں کی گوریاں جو اپن کے چون چھوچھو کر جیتی ہیں کب سے راہ دیکھ رہی ہیں تمہاری۔“

وہ دونوں ہٹنے لگا۔

”تو پھر چلو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”لومیرا کیا ہے؟“ رضا نے کہا۔ ”آج کہتو آج ہی جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”ضرور چلیں گے۔“ ایلی بولا۔

جب وہ محلے کے قریب پہنچ تو ایلی کہنے لگا۔ ”تو میں ذرا گھر ہوا اول مل آؤں گا۔“

”کون سے گھر جاؤ گے؟“ رضا نے لگا۔

”اپنے گھر جاؤ گا اور کہاں ایلی نے منہ پکا کر لیا۔“

”تمہاری ماں اور فرحت تو آٹھومن سے کابل چلے گئے ہیں اور تمہارے لامبا اپنی نبی کو لے کر واپس نوکری پر چلے گئے ہیں تو کون سے ملنے جائے گا وہاں؟“ پھر وہ خود ہی بولا۔

”ستیرے تو کئی گھر ہیں اور تو اتنا خوش قسمت ہے کہ وہ تیری راہ دیکھتی ہے۔ خدا کی قسم ایلی اگر وہ ایک بار میری طرف پیار سے دیکھ لے تو میں پا گل ہو جاؤں۔ سب کو چھوڑ دوں۔“

ایلی پا گلوں کی طرح چلانے لگا۔ ”تم فضول باقیں کرتے ہو بے کار باقیں، چھوڑو مجھے۔“ وہ بنا کر غصے میں چینخے لگا۔ اور غصے کا بہانہ بنا کر وہاں سے چل پڑا۔

محلے کا چوگان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ بوڑھے کھانس رہے تھے۔ پچھلیل رہے تھے۔ وہ رک گیا۔

محلے والیوں کی نگاہیں ایلی پر مرکوز ہو گئیں۔

”اپنا ایلی آیا ہے۔“ ایک بولی

”اے ہے کیوں نہ آئے راب بھی نہ آتا یا۔“

”کیوں اب کیا ہے ماں“

”اے ہے یہیں تو موقعہ تھا،“ ماں ہنسنے لگی۔ ”اللہ رکھے سینا لڑکا ہے کوئی بیوقوف ہے کیا۔“

”آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔“

وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

”آ جاؤ آ جاتورک کیوں گیا۔ ایلی اماں صدقے۔“

”پر ماں تو ہے ہی نہیں جو صدقے ہو۔ کیوں ماں؟“ ایک نس کربولی۔

”اس کی تو اللہ رکھے ان گنت ماں میں ہیں کیوں ایلی۔“

”عین اس وقت کھڑکی میں سے شہزادے سر نکال کر کہا کب آیا تو ایلی۔“

دوسرا بولی ”ایک تو یہ بولی۔“

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ایلی پسینے میں شر ابو رہم گیا۔

”ماں،“ شہزاد کھڑکی سے چلانے لگی ”جو بولنے میں ہزار ہے وہ پچکے چوڑی چوری میں نہیں۔“

”ہائے ریڑ کی کیا کہہ رہی ہے تو،“ ماں نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ ”جومنہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔ ذرائبیں جھجکتی۔“

”جھجکنے کا زمانہ ماں گزر گیا۔ بات پر ایسی ہو جائے تو جھجکنا کیسا۔“

”لوسن لو، بہن یہ رکی تو بس صد ہے۔“ وہ پھر سے ہٹنے لگیں لیکن یہ نہیں کس قدر مختلف تھی۔ ایلی کا پسینہ سوکھ گیا۔

”آجھے چائے پلاوں۔ بالکل تیار ہے ایلی۔“ شہزادے با آواز لند کہا۔
”جا چاپی اس کی تو۔“ ماں نے پھر بات شروع کی۔

”اچھے موقع پر آیا ہے تو محلے میں ایک نہیں چارشادیاں،“ ایک نے بات کا رخ بد لئے کی کوشش کی۔
”اے بی بی، ماں بیوی!“ اب تو اس کی شادی کی فکر کرنی چاہئے۔“
”من رہی ہے تو،“ ایک نے شہزادو کی طرف نحاطہ ہو کر کہا۔ ”کوئی اس کے بارے میں بھی فکر کر،“
”ایسی بیوی لاکانگی اس کی،“ شہزادے گہرا ہٹ کے بغیر کہا۔ ”کہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔“
”کوئی ایسی نہ لے آتا۔“ ماں نے شہزادو کو طعنہ دیا۔ ”جو اپنی ای برات میں ناچنا شروع کر دے۔“

”اور کیا منہ میں گھنگھریاں ڈال کر بیٹھ رہے۔ نہ بھئی ایسی کام کی۔“ شہزادے جواب دیا۔
”بس کام کی تو تو ہی آئی محلے میں۔“ وہ پھر ہٹنے لگیں۔
”کیوں ماں دیکھو کام کی نہیں ہوں کیا۔“ اس نے سینتاناں کر کہا۔
شہزادو کی نہس مکھ جرأت اور بات کی رنگینی انہیں خاموش کرو یتی تھی۔ اور وہ سب دل ہی دل میں شہزادو کو برائی گھنٹے کے باو جو داد دینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ شہزادو کی اس بات پر وہ سب ہٹنے لگیں۔ اور ایلی کو موقعہ مل گیا۔ انہیں مصروف دیکھ کرو وہ سیدھا شہزادو کی طرف چل پڑا۔

یونچے ڈیوڑھی میں اسے مائی حاجاں مل گئی۔ ”آ جا کبھی ہماری طرف بھی آیا کرو۔“
اس نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کبھی ہم سے بھی کر لیا کر بات۔ اے ہے اتنی بے اعتنائی بھی اچھی نہیں ہوتی۔“

وہ اسے پکڑ کر اپنے گھر لے گئی۔ اور صحن میں چلاتی ہوئی کمرے کی طرف چلی۔ صحن میں کئی ایک عورتیں بیٹھی تھیں۔ دلی پتلی، زرد رو میلی عورتیں۔

”نہ لڑکی یہ خود تو نہیں آیا میں زبردستی لائی ہوں اسے۔ یہ کہاں آتا ہے کسی کے ہاں یہ تو صرف کوٹھے پر ہی چلا جانا جاتا ہے چلکے سے ہیڑھیاں چڑھ جاتا ہے جیسے چور دبے پاؤں آتے ہیں۔“

مالی حاجاں کا کسرہ بہت چھوٹا اور تاریک تھا۔ اس میں ایک طرف ایک پرانا پنگ بچھا ہوا تھا۔ جس کے سر بانے مثی کے رتن پیچے اور پر لکھے ہوئے پختے ایک طرف ایک میلا ساخت پڑا تھا۔

مالی حاجاں نے اسے پنگ پر بھا دیا۔ اور خود ایک چوکی لے کر بیٹھ گئی کہنے لگی ”اے میں تو دیر سے سوچ رہی تھی کہ مجھی تو الیال جائے تو بات کروں۔ آخر میں نہ کروں تھجھ سے بات پیٹا تو کون کرنے گا۔“

ایلی کا ماتھا ٹھنکنا نہ جانے کیا کہنے کے لیے وہ اسے وہاں کھٹک لائی تھی۔ ضرور کوئی بات ہوگی۔ وہ گھبرا گیا۔

”اے ہے۔“ بولی ”لوگ تو یہی ہی باتیں بناتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں درد نہیں ہوتا نا۔ لیکن میرے لیے تو تو اپنا ہے بلکہ اپنوں سے بھی بڑھ کر عزیز۔“

”مجھے معلوم ہے ماں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اے ہے۔ برانہ مانیو میری بات کا میں تو تیرا ہی بھلا چاہتی ہوں۔“ ماں نے تمہید کے طور پر کہا۔

”ہاں ہاں ماں“ وہ بولا

”اور ویکھو یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی خیال سے کہتی ہوں۔ نہ بھتی مجھے کوئی خیال نہیں۔ تو خش رہ میں صرف یہی چاہتی ہوں چاہے جہاں مرضی ہے رہ بس میری خوشی تو اسی میں ہے۔ پر لڑکے آخر دنیا دنیا ہے۔ دنیا کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ جب لوگ تیرے متعلق

باتیں کرتے ہیں تو دل دکھتا ہے اور دیکھنا۔ پھر یہ لڑکی ہے کیا نام ہے اس کا آج گل کے نام بھی تو عجیب ہوتے ہیں۔ میں اسے برانجیں کہتی بیچاری بڑی اچھی ہے نہیں کہ ہے اور ایمانداری سے کہتی ہوں کوئی چلا جائے۔ اس قدر محبت سے ملتی ہے اور اتنی خاطرتو ارض کرتی ہے کہ میں کیا بتاؤں۔ ”ایک ساعت کے لیے وہ چپ ہو گئی پھر خود ہی بولی ”الیکن تو جانتا ہے کہ آخرا صل اصل ہے اور نقل نقل ہاں خون خون کی بات ہوتی ہے۔ ہم غریب سہی مگر ہمارا خاندان اصلی ہے۔ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں تو جانتا ہی ہے۔ خاندان بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہاں اور سچ پوچھتا تو وہ بھی چھپا نہیں رہتا۔ تم ہی کہو کیا اپنے بیاہ پر کبھی کسی کو گاتے سنائے۔ ایمان سے کہنا تو یہے آخر لانج بھی کوئی چیز ہے۔ ہے ناپنے ہی بیاہ پر گاتی رہی اور محلے والیاں سب مدد میں انگلیاں ڈالنے لے حیرت سے تک رہی تھیں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”سو بیٹا“ وہ پھر بولی۔ ”اس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلتا گیا تو کیا ہو گا یہ راستہ اچھا نہیں۔ اس کے لیے تو گھری بھر کا تماشا ہو جائے گا۔ گھلاؤ کی کوتو کھیل چاہئے پر تیری ساری جندگی حرام ہو جائے گی ہاں کہے دیتے ہوں میں تجھے۔ آگے تو چاہے جو کر ہمارا کام تو صرف تجھے بتاوینا ہے۔ آخر تو ہاجرہ کا بیٹا ہے اور ہاجرہ سے بڑھ کر ہمیں اور کوئن عزیز ہے اور ایلی دیکھیو جو مرضی ہے کر پرانے ابا کے قدموں پر نہ چلنائے بیٹا۔ یہ راستہ اچھا نہیں۔ نہ اللہ رسول کو پسند ہے اور نہ کسی اللہ کے بندے کو تو تو بڑا ہی اچھا لڑکا ہے۔ اب بتا کیا بناوں تیرے لئی لئی پئے گا یا شربت؟“

”نہیں ماں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ تو تکلیف نہ کر“ ایلی اٹھ بیٹھا۔

”اے ہے بیٹھ تو سہی کچھ دریکے لیے۔“

”پھر آؤں گاماں۔“ وہ بولا

”میری بات کا براؤ نہیں مانا تو نے۔“

”نہیں ماں۔“

بھگارن سے دیا

ابھی وہ صحن میں ہی پہنچا تھا کہ پھر سے شہزادنا چتی ہوئی آپنی۔

”ہے میں نے کہا،“ وہ بولی ”نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔ میرے سامنے تو چل پڑا تھا چوگان سے پھر چلا گماں گیا۔ حیرت کی بات تھی، کیوں ماں۔“
”تو کیا اس سے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتی ہے لڑکی۔“ ماں نے فس کر طعنہ دیا۔
”کیوں نہ رکھوں ماں،“ وہ پختے گئی ”رکھنا پرستا ہے۔ ذمہ دار کی کی بات جو ہوئی۔“
”اب تو میرا ہی مہماں ہی یہ۔ جب فرحت اور ہاجرہ ہوتی تھیں جب اور بات تھی۔“
اب میں نہ رہیاں رکھوں گی تو وہ آ کر کیا کہیں گی۔“
”اب تو ان کا بہانہ نہ بننا۔“ ماں بولی۔

”بہانے بھی بنانے ہی پڑتے ہیں۔“ وہ رازدارانہ انداز سے کہنے لگی۔

”ہائے رئی کیا کہہ رہی ہے تو“ ماں نے انگلی منه میں دبایی ”تیری یہ باتیں لے ڈو یہیں محلہ والوں کو۔“

”لو ماں،“ وہ پھر بخشنے لگی۔ ”فی الحال تو مجھے ہی لے ڈوب رہی ہیں۔“

”تون ڈوب کس نے تجوہ سے کہا ہے کہ جو منہ میں آیا بک دینا۔“ ماں نے فس کر کہا۔

”چل اب جو چائے پیتا ہے یہ۔ میں نے کتنی ہی ملتیں کیں کہ یہاں پی لے۔ پاس لڑکے نے نہ کی رٹ لگائے رکھی۔“

جب وہ سیرھیاں چڑھنے لگے تو ایلی نے شہزاد کا پلو کپڑا لیا۔

”ذریبات تو سن،“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

لیکن شہزاد تھیں لگاتی ہوئی ہوائی کی طرح اوپر چڑھنی۔

اوپر جا کرو ہ چیخنے لگی۔ ”اب آؤ گے بھی یادو مزدوروں کو بلاؤں اٹھانے کے لیے۔“

اس کا دوپٹا میلی کے ہاتھ میں رہ گیا۔

اس کی بات سن کر رابعہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ”کس کو اٹھوانا پڑے گا۔ کسے باقیں کر رہی ہوتی۔“

”تمہارا ہی بھائی بندے کے کوئی اور پرچھنے کا نام ہی نہیں لیتا،“ شہزادہ فتحی۔

”اوہ تمہارا دوپٹہ کیا ہوا۔“ رابعہ نے پوچھا۔

”پوچھو اسی سے۔“ وہ بولی ”اس کا کیا اختبار ہے آج میرا دوپٹہ اتار لیا ہے۔ اس نے کل نہ جانے زیور اتارتے کے لیے کان مروز لے۔ نہ بھائی یہ تھا مارے رشتہ دار مجھ سے نہیں سنبھالے جاتے۔“

”سلام کہتا ہوں۔“ میلی نے اور پرآفرڈ ایجنسی کے کہا۔

”تو ہے ایلی،“ وہ بولی ”میں بھی نہ جانے کس سے شکستی کڑتی ہوئی آئی ہے۔“

”یہ تیرا بھائی بند کیا کڑے گا کشتی۔“ شہزادہ فتحی۔ ”اس کی صورت تو دیکھو۔“

”صورت تو اچھی بھلی ہے۔“ رابعہ نے ہستے ہوئے کہا۔

”دیکھو۔“ وہ بولی ”یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی روئے گا۔“

ایلی کو شہزادہ پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اس کی باقیں سن کر اور اس کی فتحی دیکھ کر وہ بھی ہٹنے لگا۔ اور وہ دونوں ہستے ہوئے اور پرچو بارے میں چلے گئے۔
چو بارے میں کھڑی تھی۔

”کیوں جانو چائے بھی بنائی یا نہیں۔ دیکھ تو مہمان عین سر پر پہنچ گیا ہے۔“ شہزادے
پوچھا۔

”بڑا مہمان تو دیکھو۔“ جانوبولی۔ ”ایسون کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔“

”تو کیا سمجھتے ہو؟ میں بھی بتاؤ بھی۔“ اس نے جانو سے کہا۔

”یوں بے ایمان ہے۔ مہمان تو دو دن کا ہوتا ہے۔“ جانو نے کہا۔

”کیوں تم سے کوئی بے ایمانی کی ہے اس نے۔ شرماتی کیوں ہو بتا دے میں کسی کو

بناوں گی تھوڑی۔“

”اے ہے مجھ سے کیوں کرے بے ایمانی تم جو ہو۔“ جانو نغمے میں آگئی۔

”لے ایلی مجھ سے کراس سے نہ کریو۔ یورپری۔“ شہزادے کہا۔

جانو نیچے چائے بنانے کے لیے ایلی ایلی پھر سے ہاتھ پھیلا دیئے۔

”شہزادہ وہ بولا“ شہزادیری طرف دیکھو۔

”بس تم تو بھکاری ہی رہے۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگی ”ہاتھ پھیلانے کے علاوہ تمہیں کچھ سوچتا بھی ہے۔“

”تمہیں کچھ نہیں سوچتا۔ کچھل جائے تمہیں۔“ ایلی نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

”بھکارن سے دیاماں نکلتے ہو۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے۔“ شہزادے آہ بھری۔

”سمجھ لوٹ گیا۔ اب بھکاری آیا بھی تو کیا آیا۔ اب اسے کوئی کیا دے، کیا دے۔“ شہزادے بھر پور نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”شہزادہ“ ایلی دیوانہوار اس پر جھپٹا ”میں پا گل ہو جاؤں گا۔“

”ہو جاؤ ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔“ شہزادہ ہنسنے لگی۔

ایلی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہوار اسے چومنے لگا۔ اور شہزادیوں کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی جیسے اس ہاتھ سے اسے کوئی تعلق نہ ہو۔

جانو چائے لائی تو وہ چونگی۔ ٹرے لے کر شہزادے میز پر رکھ دیا۔ اور زیر دستی ایلی کو کرسی میں بٹھا کر کہنے لگی ”لواب یہاں بیٹھ کر چائے پیو۔ میرے سامنے بیٹھے رہو اور میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔“ اور پھر اس کے سامنے تخت پر بیٹھ کر بیوں سلائی کے کام میں مصروف ہو گئی جیسے اسے ایلی سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ ایلی پا گلوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بازو اور ماتھے کے تل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر شارہوئے جارہا تھا۔

دور بہرن میں جانو بیٹھی ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

آخر جانو سے نہ رہا گیا وہیں سے چلا کر بولی ”اے لڑکے کیا ہو گیا ہے تجھے، یوں دیکھ رہا ہے جیسے پا گل ہو گیا ہو۔ ہوش میں آ۔“

”اونہوں“ شہزادرا اٹھائے بغیر بولی۔ ”سب بے کار ہے جانو۔ پا گل کبھی ہوش میں نہیں آیا کرتے۔ تم کیوں اپنا بھی جلا رہی ہو۔“

”تو نے اسے کر دیا پا گل“، جانو غصے میں پھنس کارنے لگی۔

”اونہوں“، وہ ہوئے ہی بے پرواہی سے بولی۔ ”میں کیا کروں گی پا گل جانو۔ میں تو اپنے میاں کو پا گل نہ کر سکتی۔“

”وہ تو پہلے ہی پا گل ہو رہا تھا۔ اس کی کیا بات؟“ جانو بولی۔

”تو بہ ہے۔“ جانو نے کاؤں کو اچھا لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب تجھ سے کون کرے بات۔“ یہ کہہ کر وہ غصے میں اٹھ کر نیچے چلی گئی۔

”تو نے مجھے بدنام کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ ہے نا۔“ شہزاد نے آنکھیں اٹھائے بغیر ایلی کو منا طب کیے بغیر کہا۔

”سبھی مجھے طعنے دیتے ہیں میں سمجھتی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں میں لیکن کیا کروں۔ تو نے مجھے یہاں رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

”میں بہتر ہوں۔“ ایلی نے خلوص سے کہا۔

”ہو گا۔“ شہزاد نے بے پرواہی سے کہا ”لیکن مجھے نہ جانے کیوں اچھا لگتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے تجھے سامنے بٹھا ہے رکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں تیری خاطر میں ان کے ساتھ بھی نہیں گئی ہے کتنی ملتیں کی تھیں انہوں نے میری اب کی بار لیکن میرا جی ہی نہیں چاہا۔ میں نے کہا چلی گئی تو پھر نہ جانے کب ملاقات ہوتی سے اور پھر تم نے آنے میں اتنے دن لگا دیئے۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئیں۔“ شہزاد نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”نہ جانے کیا ہو گیا ہے ایلی۔“ وہ بولی ”ہائے انجانے ہی میں ماری گئی اور یہ سب محلے والیاں مجھے تمہارے طعنے دیتی ہیں۔ جلی

کئی سناتی ہیں۔ ہر روز ہر وقت۔“

”شہزاد،“ ایلی اچھل کر اس کے قریب آگیا۔

دفعتاً وہ طلس مٹنا اور شہزاد کو یا جاگ پڑی۔

”نه،“ وہ بولی ”ایمانہ کر ایلی میری پنی نکاہ میں تو میری عزت رہنے دے۔ مجھے اپنی نگاہ میں نہ گرتا ہے تو کچھ نہیں جائز گا ایلی میں اپنے آپ سے جاؤں گی۔“

”تو میں کیا کروں؟“ ایلی نے گھبرا کر کہا۔

”وہیں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کر۔ میری باتیں سن۔ میں اپنی بات کے سزاوں تو نے ہی نہ سنتی تو کون سے کلا۔ ایلی،“ وہ روپے کے پولے سے آنسو پوچھنے لگی۔ ”لیکن تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔ تو تو صرف ہاتھ پھیلانا جانتا ہے۔“ تجھے دینے کے لیے میرے پاس کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کیا مانگتا ہے مجھ سے تو جس کے پاس دینے کو کچھ بھی نہ ہوا س کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا فائدہ واہ ایلی۔“ اس نے اپنا سر روپے میں لپیٹ لیا اور گھڑی بن کر پڑ گئی۔

گوشت کا لوگو

شام کے وقت شہزاد نے کپڑے بدالے اور بڑے اہتمام سے بناو سنگار کر کے بیٹھ گئی۔ ایلی کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ اہتمام اس کی آمد کی وجہ سے ہے۔ شہزاد کے اس اہتمام کی وجہ سے وہ بے حد خوش ہو رہا تھا۔

شہزاد کی طبیعت میں بلا کی بے نیازی تھی۔ اس نے کبھی سنگار کے لیے سرخی یا پاؤڈر استعمال نہ کیا تھا اس زمانے میں عورتیں سرخی پاؤڈر استعمال کرنے کے باعث حار سمجھتی تھیں۔ کیونکہ بڑی بوڑھے اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ عورتیں سرخی پاؤڈر لگا کر اپنی نمائش کریں۔ اگرچہ خوبصورت کپڑے اور زیور پہننے کو معیوب نہ سمجھا جاتا۔ کپڑا اور زیور پہننا تو عورت کا ازالی حق ہے۔

شہزاد ہمیشہ خوبصورت کپڑے پہننے رکھتی تھی اگرہ اس کی پوشاش میں نمائش کی جگہ

سادگی کا غصر ہوتا تھا اس کی آنکھیں لمبی اور خوبصورت تھیں اور اس کے ماتھے پر قدرتی طور پر ایسے مقام پر تسلی تھا جہاں ہندو عورتیں ٹیکایا بندی لگاتی ہیں۔ اس کی پیشائی اور آنکھیں اس قدر رجاذب نظر تھیں کہ ہننوں کاموٹا پن اس کے حسن میں کبھی حارج نہیں ہوا تھا۔

ایلی اس کے سیاہ جالی دار دوپٹے جس پر سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ شام کے وقت شہزاد کا پیڑے بدل کر بیٹھ جانا۔ اس کی آمد کی وجہ سے تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی میرے لیے اس قدر پرواکے۔ میرے لیے بنے سنورے پھر بھی چوری چوری دل ہی دل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی کے لیے ہے، شام کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کیونکہ سے شور بلند ہوا۔ چھتی گل سے عورتیں آوازیں دے رہی تھیں۔ بلا رہی تھیں۔

”اب تو جلدی بھی کرے گی یا نہیں۔“ جانو نے شہزاد سے کہا ”تو یہاں اپنی دہن میں لگی ہے اور وہ سب نیچے تیرا انتظار کر رہی ہیں۔“

”انتظار کر رہی ہیں۔ کون انتظار کر رہی ہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اے ہے محلے کی عورتیں اور کون۔ شادی والے گھر گانے کے لیے نہ جائے گی کیا۔ تو سمجھتا ہے یہاں تیرے سرہانے بیٹھدے ہی گی کیا۔“

”شادی والے گھر۔“ ایلی نے گھبراہٹ بھری شرمندگی سے کہا۔ وہ شادیوں کی بات قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

”اور کہاں۔“ جانو بولی۔ ”تیری شادی ہو گی تو تجھے معلوم ہو گانا کہ شادی والے گھر گانے کے لیے جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں۔“

”اے ہے کیوں خواہ مخواہ مفرضات رہی ہو۔“ شہزاد جانو کو کوئے لگی۔ ”جا تو رہی ہوں۔ جلدی آ جاؤں گی میں۔“ وہ ایلی سے کہنے لگی۔ ”تو جب تک کوئی اپنی کتاب پڑھنا۔“ اس نے ایلی پر ایک زگاہ التفات ڈالی اور پھر سیاہ پھولدار دوپٹے کے سر پر لے کر

یوں آنکھیں بنا کر ایلی کی طرف دیکھنے لگی کہ اس کی قوت گویاں سلب ہو کر رہ گئی۔ اور پھر جب جانوں سیڑھیوں میں داخل ہو گئی تو شہزادے نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا اور اس کے چہرے کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”کونہ جانا۔ میں ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں میں داخل ہو گئی اور ایلی تہمارہ آیا۔

دیر تک وہ چپ چاپ پڑا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شادی والا گھر تو وہی ہے جہاں غفور رہتا ہے۔

اسے بچپن ہی سے غفوں سے نفرت تھی۔ صرف غفور ہی بے نہیں ان کے سارے گھرانے سے نفرت تھی۔ اگرچہ وہ آصفی محلے میں رہتے تھے اور آسفیوں سے گھرے تعلقات تھے۔ پھر بھی غفور اور اس کے یا نجپوں بھائی آسفیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور خود کو قریبی کھلواتے تھے۔

وہ محلے سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جسمانی لحاظ سے بھی ان کی ساخت الگ ہی تھی۔ ان کے جسم بھرے ہوئے تھے قد چھوٹ اور جھرے گول تھے انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتا تھا جیسے وہ گوشت کے لوقرے ہوں ایسے غلیظ لوقرے جیسے علی پور کے بوجڑ خانے میں اس نے بارہا دیکھے تھے۔ جہاں گائیاں اور بھینیں ذبح کی جاتی تھیں۔ حالانکہ غفور کے علاوہ اس کے باقی بھائی جہت شریف سمجھے جاتے تھے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے محلے میں داخل ہوتے اور چپ چاپ سر جھکائے باہر نکل آتے۔ اول تو وہ محلے میں آتے ہی نہیں تھے کیونکہ ان کا مکان محلے کے ایک کونے میں واقع تھا۔ یہ کونہ بازار سے عین ملا ہوا تھا اور انہوں نے براہ راست بازار سے آنے جانے کا راستہ بنارکھا تھا جو محلے کی ڈیوڑھی سے بھی ہٹ کر تھا۔ لہذا انہیں گھر آنے جانے کے لیے محلے کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ سب و یہ نہ ہوں جیسے وہ دوسروں کے رو برو دکھائی دیتے تھے جھکے ہوئے سر کے باوجود ان کی نگاہوں میں محلے والوں کے لیے تمثیری

بھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہونٹوں میں تحقیر کا احساس دبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ ادب و احترام سے کسی کو سلام علیکم کہتے تھے تو محسوس ہوتا جیسے محض دکھاوے کے لیے بات کر رہے ہوں اور اگر ان کے ہاں کوئی محلے دار چلا جاتا تو اس کی آمد پر یوں خاموشی چھا جاتی جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ حتیٰ کہ نووارہ کو محسوس ہونے لگتا کہ بگاؤں کی محفل میں بیگانہ آگیا ہے۔ وہ سب کاں سے منہ جوڑ کر بات کرنے والے تھے۔ ان کی شکلیں دکھانے کی محسوس ہوتی تھیں اور ان کی باتیں ہاتھی دانت۔ ممکن ہے ایلی کے یہ احساسات دراصل ایلی کے من گھرست بعض ہوں۔ ممکن ہے کسی وجہ سے ایلی نے کوئی لاشعوری الجھن پال رکھی ہو۔ اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے احساسات اختراع کر رکھے ہوں۔ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی کہ ایلی کو غفور اور اس کے بھائیوں کے بعض تھا۔ بھائیوں کی بات چھوڑنے یعنی غفور کی ذات سے تو اسے بے انتہا چہرے تھی اور محلہ میں ہر کوئی جانتا تھا کہ غفور کے روپ سے خود اس کے بھائی بھی نالاں تھے۔

عام طور پر ایلی کی غفور سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی ہوتی تھی تو کچی جو ایلی کے قریب چونکہ عام طور پر غفور محلے کی مسجد میں نہانے جایا کرتا تھا نہانے کے لیے وہ اس راستے سے باہر نکلتا تھا جو محلے کے اندر کی چھوٹی گلی میں کھلتا تھا۔ ایلی نے چھوٹی گلی میں ہاتھ میں صابن دانی اور تو یہ پکڑے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بے حس انداز میں آگے بڑھے چلا جاتا۔ اور ہر عورت اور لڑکی کی طرف ایسے بے باکانہ دیکھتا جیسے اس کے جسم کو جانچ رہا ہو۔ جیسے قصائی بوچڑھانے میں گایوں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی وہ جسم کھجاتا۔ اس وقت ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بورا بھالو ہوا اور اوپر نیچے سے اپنے جسم کو تسلیکین دے رہا ہو۔ یا کسی کو کچھ سمجھا رہا ہو۔ یہ محسوس کر کے ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا لیکن غفور طاقت میں الی کے مقابلے میں پہلوان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بے بسی بھرا غصہ ایلی کے احساس مکتری پر تازیانے کی حیثیت رکھتا وہ کھولتا اور پھر بھاگ لیتا۔

اس روشنہراو کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے ایلی سوچ رہا تھا کہ وہ بیٹھی گا رہی ہو گی۔ گاتے وقت وہ کتنی پیاری لگتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے اس کی آنکھوں میں منخفی قدیمیں روشن ہو جاتی ہیں اور ان سے چھن چھن کر شعاعیں لگتی ہیں۔ عورتیں تعجب سے اس کی طرف دیکھتیں تھیں۔ اس وقت نگین دوپتوں کے اسر ڈھیر کے قریب ایک بھورا بھالوا آ کھڑا ہوتا۔ اس کی نگاہیں شہزاد پر کوز ہو جاتیں۔ اور پھر اس کا پنجہ اٹھتا۔ اور وہ کھجانے لگتا۔ اتنے زور سے کھجاتا کہ اس کے بال اکھڑ جاتے اور نیچے ہے نئے غایظ کوشت کا لوہرا کل آتا۔

ایلی غصے سے گھولے لگتا۔ ۲۰۰۲ء
All rights reserved.
www.mehmood.com
کھروہ لا حول پر کھرا پانی توچہ کی اور طرف بمعطف کر کر نیکی کی کوشش کرتا۔ مگر جلد ہی پھر اس گانے والیوں کے نگین بھر مٹ سے وہی بحالوا بھرتا اور وہی بھیا کنک منظرِ حقیقت بن کر اس کے رو بروآ کر کھڑا ہوتا۔

ٹن۔۔۔ گھڑی نے ایک بجا یا۔

ایک، اس نے گھڑی کی طرف غور سے دیکھا۔ ساڑھے بارہ ساڑھے بارہ بیج تک کون گاتا ہے اس نے سوچا۔

میں اس وقت نیچے چوکاں سے اسے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شکر ہے اس نے سوچا یقیناً وہ بھی ان کے ساتھ ہی آ رہی ہو گی۔ بس پہنچا ہی چاہتی ہو گی۔ وہ منتظر ہو کر بیٹھ گیا۔ ابھی وہ آ کر آواز دے گی اور میں جھٹ سے دروازہ کھول دوں گا اور کہوں گا دیکھا یوں کیا کرتے ہیں انتظار۔ آواز دیئے بغیر دروازہ کھول دیا۔ پاؤں کی چاپ سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھا ہے تم نے۔ لیکن عورتوں کی آواز مدمم پڑ گئی۔ دروازوں پر نگین دی گئیں۔ درواز کھلے اور بند ہو گئے اور محلے پر ایک بار پھر سنانا چھا گیا لیکن شہزاد کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دی۔

دفعتا ایلی کی نگاہ کے سامنے وہ تنگ گلی آگئی جس میں غفور صابون دانی اور تویہ تھامے

ہوئے کھجاتا ہوا گز را کرتا تھا۔ گلی میں ایک طرف شہزادے کی ہوئی کھڑی تھی دوسرا طرف ایک بھالو کھجا کھجا کر گوشت کے لٹھرے بنائے جا رہا تھا۔ پھر وہ شہزادے کی طرف لپکا اور گلی کے اس حصے پر تاریکی اور بھیا نک خاموشی چھانی۔

ایلی پا گلوں کی طرح اٹھ بیٹھا اور روپیانہ مارا دھرا دھر لٹھانے لگا۔ بے بسی اور غصے میں اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن محلہ پر سوت کی سی خاموشی طاری تھی۔

میں یہاں اس کے انتظار میں پا گلی ہو رہا ہوں ایلی نے سوچا۔ جب جی چاہے آئے مجھے کیا۔ چاہے ساری رات گلی کے اس تاریک کونے میں بسر کر کو دے آخر مجھے اس سے کیا فرض یہ سوچ کروہ لیت گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نگاہوں تلے بھالو ناق رہا تھا۔ قریب ہی ایک رنگیں ڈھیر سا پڑا تھا اور گلی خوف کے مارے بھیا نک اور سفان ہو رہی تھی۔

ہستے رو تے

دروازہ بجا تو چونکا۔ بھاگ کر اس نے کندھی کھول دی اس وقت وہ بھول گیا کہ شہزادے کے آنے یا نہ آنے سے اسے کیا غرض تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ عرصہ دراز تک اس نے یوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے مدت سے سوچ کا ہو۔

شہزادہ کھر پہنچتے ہی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ ”تو بہے۔“ وہ بولی ”گاگا کر لے کان ہو گئی سر یوں بھن بھن کر رہا ہے جیسے بھڑوں کا جھٹتہ ہو۔“

”لو،“ جانی چلانی ”تو کیا اب کپڑے بھی نہ بدلو گی۔“

”اپنی جان کھائیں کپڑے۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت بھی ہو۔“ یہ کہہ کروہ سر ہانے تلے بازور کر ایلی کو بلائے بغیر یوں سو گئی جیسے ایلی وہاں موجود ہی نہ ہو جیسے ایلی نہ جانے کون

-۶۰-

اور ایلی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رنگیں ڈھیر کو دیکھتا اور کمرے کے دروازے سے باہر اندر ہرے کونے میں بھالو ناق تارہا۔ اور سرخ گوشت کے لٹھرے ابھرتے رہے۔ حتیٰ کہ

صحح کی سپیدی جھلکنے لگی اور تھک ہارا میلی کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز جا گئے تھی شہزادے ایلی کے کان میں تنکے چھبو نے شروع کر دیئے۔

”مگھوڑے بیچ کر سوئے ہو کیا اب جاؤ گے بھی یا نہیں۔ دیکھو تو دن چڑھ آیا ہے۔“

شرم نہیں آتی ”میلی چلایا“ ساری رات انتظار کرایا اور اب تنگ کر رہی ہے۔ ”تو بہ ہے۔ ”وہ بُٹی“ جب کوئی موجود نہ ہو بیٹھ کر انتظار کرتا ہے اور جب موجود ہو۔ وہ ہستے ہستے رک گئی۔

”تو پڑا خرا لے کر سوئے جاتا ہے۔“

اس بات پر ایلی کو اور غصہ آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ شہزادہ اپنی غلطی تسلیم کر لے گی اور اس سے وعدہ کرے گی کہ آنکھوں پہنچی اتنی دیری باہر نہ رہے گی۔ لیکن شہزادہ اس معاملہ میں بالکل مجبور تھی۔ نمائش کا جذبہ آن گی آن میں اس میں یوں ابھرتا تھا جیسے بوتل سے جن لکھتا ہے اور پھر وہ اپنا آپ بھول جاتی۔ اور دیوانہ وار اس جذبے کی تسلیم کے لیے مضطرب ہو جاتی۔

اس روز جب وہ ایلی کو سمجھا رہی تھی۔ ”نہ پیارے اس طرح بات بات پر نہیں بگڑا کرتے۔ یہ کیا بگڑنے کی بات ہے چلو تم بر امانت ہو تو میں آج سے گانے نہ جاؤں گی لیکن معلوم ہے میں نہ گئی تو محلے والیں کیا سمجھیں گی کیا کہیں گی۔ ایک دوسری سے گانا تو کوئی بڑی چیز نہیں ذرا اول لگا رہتا ہے۔ ہم بھی دو منٹ کے لیے جی لیتے ہیں۔ اگر تو بر امانت ہے تو نہ سکی۔“

عین اس وقت نیچے ڈیوڑھی سے نائن کی آواز آئی۔ ”لبی حسن دین کے گھر سے بلاوا ہے۔ آکر بری کی چیزیں دیکھ لو۔“

”بلاوا ہے۔“ شہزادے اپنے آپ بولی۔ ”بری کی چیزیں دیکھنے کا بلاوا ہے۔“

بری کی بات سن کر شہزادے کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور گرد و پیش و پنڈلا کر رہ گئے۔ یکدم ایلی کا وجود اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا اور ایلی سے کیسے ہوئے تمام وعدے

فراموش ہو گئے۔ لپک کر اٹھی اور ٹرنک کھول کر کپڑے نکالنے لگی اور پھر آئینے کے سامنے سنگار میں مصروف ہو گئی۔ ایلی جیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ”تم جا رہی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

شہزادے خالی زگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”تم کہہ رہے ہو کچھ۔“ اس نے ایلی سے پوچھا۔ اس بے تعقیٰ کے اظہار پر ایلی کا منہ غصے میں لاال ہو گیا۔ لیکن شہزادے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس وقت وہ ٹرنک سے اپنا محبوب ہوٹ زکال رہی تھی۔ پھر وہ بات کیے بغیر غسل خانے میں واخال ہو کر کپڑے بدلتے گئی۔

جلدی جلدی وہ تیار ہوا کہ دیوں سیڑھیاں اترنے لگی۔ جیسے جانے کے سوا کسی اور بات کی سدھ بدهنے ہو۔ سیڑھیوں میں پہنچ کر وہ چلائی۔ ”جانو تو ہندیا چڑھادینا میں ابھی ہوٹ آؤں گی۔“

شہزادے کے جانے کے بعد ایلی دیر تک غصے سے کھولتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شہزادے کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا تھا۔ کہاں وہ محبت بھری باتیں کرنے والی شہزادہ جو محلے میں اس کی تلاش میں سرگردان پھرتی تھی اور کہاں یہ شہزادہ جو اس کے وجود ہی سے منکر تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان دونوں میں سے اصلی شہزادوں میں سے ایک ہے۔

دیر تک غصے میں کھولتا رہا اور پھر اپنی حماقت پر قہقہہ مار کر رہنے لگا۔ جانو اسے ہنسنے دیکھ کر چلانے لگی۔ ”معلوم ہوتا ہے تیرا دماگ بھی چل گیا ہے۔ تم دونوں ہی کا پتہ نہیں چلتا۔“ وہ بولی ”بے وجہ ہستے ہو بے وجہ روتے ہو۔“

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”اچھا میں ذرا بابا ہر جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں۔“ جانو گرائی ”اب تو یہاں کیوں بیٹھنے لگا جا کر بری دیکھیں گے تو اسے دیکھنا یہاں بیٹھا کیا کری گا۔“

جب وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ تو جانو اس کے پاس آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پکڑ کر بولی۔ ”ماں واری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے تو تجھے کس چیز کی کمی ہے۔“

جیسی چاہے گا وی مل جائے گی۔ یہاں سے تجھے کیا حاصل ہوگا۔ پھر کیوں اپنا ایمان گنو رہا ہے تو یہاں۔“

جلو

چوگان میں پہنچ کر اس نے محضوں کیا جیسے خلا میں چل پھر رہا ہو۔ اس کے لیے سارے علی پورا ایک ویرانہ تھاں دش ویرانہ جس میں صرف ایک قدمیں روشن تھیں۔ اور جب وہ رنگیں قدمیں نگاہ سے دور ہو جاتی تو گھٹا لوپ اندھیرا چھا جاتا اور پچھوڑکھائی نہ دیتا۔

”ابے تو ہے۔“ رضا اسے یوں کھڑے دیکھ کر بچایا۔ ”یہاں کیا کر رہا ہے تو جیسے کوئی کھو گیا ہو۔“

”کوئی نہیں۔“ ایلی نے جواب بولایا۔ ”میں خود کھو گیا ہوں رضا۔“ وہ پہلا دن تھا جب اس نے رضا کے روبرو اس بات کا اقرار کیا تھا۔ اگر اس وقت رضا اس کی بات نہ کافی تو غالباً وہ اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر رو دیتا۔ اور رورو کراپنی داستان کہہ دیتا۔ لیکن اس روز نہ جانے کیوں رضا خود کسی رنگیں اضطراب میں کھو یا ہوا تھا۔

”ارے یاڑ،“ وہ بولا۔ ”آج وہ رونق ہے وہ مشغلوں ہیں کہ حد ہے۔ ہر لوگ کسی نہ کسی واک پر لگا ہے۔ لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آ جا رہے ہیں تا نک جھانک ہو رہی ہے۔ لوگ ڈیوڑھیوں اور تنگ گلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں اور تو تو یہاں کھڑا ہے جیسے۔“

ایلی چپ کھڑا رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر رضا بولا۔ ”آئیں تجھے سائیں کے پیڑے کھلاوں کیا کرے گا تو چل اب۔“ اور وہ دونوں سائیں کی دکان کی طرف چل پڑے۔ دریتک وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے الی اپنے خیال میں کھو یا ہوا تھا۔ اور رضا کسی اپنی بات میں مگن تھا۔ فرق یہ تھا کہ بیکھی کی خاموشی مایوسی بھری تھی اور رضا میں ایک امید بھرا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔

وتفتا ایلی رک گیا۔ ”رضا ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“ رضا نے اپنا سومناز میں پر لیک کر لنگڑی ناگ اٹھائی۔ ”کہو۔“ وہ بولا۔

اس وقت ایلی کو احساس ہوا کہ اس نے رضا سے کچھ کہا ہے۔ شاید وہ اپنا راز بتانے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔

”کہونا“ رضا بے تابا نہ بولا۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہے۔ وہ ایک ساعت کے لیے سو چار بار پھر بولا ”رمایہ راجی نہیں گلتا۔“

”تو پھر“ وہ بولا

”پھر“ ایلی نے دہر لیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پھر کے جواب میں کیا کہے۔ ”یہاں سے کہیں طے جائیں؟“ ایلی سے منہ نکل گیا۔

”لیکن جائیں کہاں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔“ رضا بولا پھر دعطا وہ چلایا ”اوے وہ ارجمند جو ہے بیچارا کب سے ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔ بیکار پڑا ہے۔ کہتے ہیں وق ہے۔ اس کا بڑا بھائی تو جوانی میں وق سے مر ا تھا۔“

”ہاں ارجمند جو ہے۔“ ایلی نے محسوس کیا کہ اس کا علی پور سے جانے کا شوق مدھم پڑتا جا رہا ہے۔

”تو کب چلیں؟“ رضا نے پوچھا۔ ”آج ہی کہی۔ چاہے ابھی چلو۔“

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

رضا نے سونٹا دونوں ہاتھوں میں قھام لیا ”اب آپ ہی بات کر کے پیچھے ہتا ہے۔“ وہ اسے گھورنے لگا۔

ایلی بھی جوش میں آ گیا ”تو چل ابھی سہی۔ میں اپنا سوت کیس اٹھالاؤں۔“

”ہوں سوت کیس،“ رضا چلایا اس کی کیا ضرورت ہوگی۔ بابو بنا پھرتا ہے۔

”اچھا تو ابھی لاسوت کیس اپنا میں انتظار کروں گا۔“

”تو نہیں جائے گا گھر اطلاع دینے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اپنا کیا ہے۔“ وہ بولا ”کسی کے ہاتھ کھلانہ بھجوں گا کہ مال لینے جا رہا ہوں تو جا بھاگ۔“

جب ایلی گھر پہنچا تو اس کا دل دوستاد خواہ شات میں بٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں اسے خیال آتا ہے بتائے بغیر میں کہیے جا سکتا ہوں۔ جب اسی معلوم ہو گا تو وہ کیا کہے گا۔ اور پھر آٹھ چھٹیاں صائم کروئیں پھر نہ جانے کب علی پور آنا نصیب ہو۔ دوسرے لمحے میں وہ سوچتا ہے کیوں بیجا اس کا انتظار کھینچتا ہوں اور وہ یوں گانے میں اور بری جیزیز دیکھنے میں مصروف رہے۔ کافی تو محض بہانہ ہوتا ہے۔ مقصد تو اپنی نمائش کرنا ہوتا ہے اور اور پھر اس وقت اس کی زگا ہوں تک وہ کھجاتا ہو ابھا لو آ کھڑا ہوتا۔ شہزاد ڈالڈی بجا بجا کر گاتی ان خیال پر ایلی کو از سرنو غصہ آگیا۔ اس لپک کر سوٹ کیس اٹھا لیا اور چپکے سے میڑھیاں اترنے لگا۔ راستے میں کبی بار جی چاہا کہ لوٹ جائے۔

علی پور سے نکلتے ہی ایلی کو وہاں سے چلے آنے پر افسوس ہونے لگا۔ دل میں درد ہونے لگا۔ گاڑی چھکا چھک چلے جا رہی تھی۔ دور ہرے بھر کھیتوں کے پرے شہزاد کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ”نہ جاؤ نہ جاؤ تم کیوں چلے گئے ہوا ایلی کیا تم مجھ پر اعتناء نہیں کر سکتے۔“

”ایلی۔“ شہزاد جیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔

سٹیشن پر اتنے کے بعد ایلی نے ان چند کچے گھروندوں پر زگاہ ڈالی جو ریلوے سٹیشن کے پاس ڈھیر ہو رہے تھے۔

چمار کی دوکان پر چارا یک آدمی کھاث پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کے قریب ہی دو آدمی زمین پر بیٹھے اونگھرہ رہے تھے۔ باعیں ہاتھ کیکر کے درخت تلے ایک گدھا کھڑا تھا جس پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اس کے قریب ہی کوئی پر چا درا یک بحدی اور میلی عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچے گھروندوں کے چاروں طرف دور دور تک بخجر زمین کا وسیع پھیلا دے۔

تو محض ویران ہے۔“

”اور کیا ہو پیارے۔“ رضا چلایا۔ ”گاؤں تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن لیکن ارجمند تو کہتا تھا۔“

رضا نے قہقہہ لکایا۔ ”اے تو نکلے کی عادت ہے جسے جاتا ہے۔“ ”وہ تو بندرا بن

بنائے بیٹھا ہے۔“ ایلی نے کہا

”دیکھو لو بندرا بن،“ رضا ہٹنے لگا۔

”وہ تو کارخانے میں کام کرتا ہے نا۔“ ایلی نے پوچھا۔

جلو کا تارپین کا کارخانہ گاؤں سے میل کے فاصلے پر تھا۔ شیش سے ایک چھوٹی سی لائن کارخانے کی طرف جاتی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی ٹرالیاں چلتی تھیں۔

کارخانہ ایک وسیع چوگان میں تھا جس میں عمارتیں اور مشینیں تو کافی تھیں لیکن بیشتر عمارتیں ویران پڑی تھیں اور اکثر مشینیں بے کارکھری زنگ آؤ دھوکھی تھیں۔

کارخانے کے جنوبی حصے میں مزدوروں اور ملازمین کے لیے کوارٹروں کی چند ایک قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ بہت دیر تلاش کرنے کے بعد انہیں ارجمند کا گھر ملا۔

مرلی کارسیا

وہ ایک چھوٹا سا کوارٹ تھا۔ مختصر سے صحن میں ایک چھوٹا سا باہر پیچی خانہ اور غسل خانہ بنتا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا۔

کمرے میں ایک طرف چارپائی پار محمد لیٹا ہوا تھا۔ چارپائی کے قریب اس کی ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف ارجمند کی ہمیشہ چپ چاپ بیٹھی رہ رہی تھی۔ چارپائی پار محمد کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ چھرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقات پڑے ہوئے تھے۔ ایلی نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا ”یا اللہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔“ اس کے قریب رضا لاٹھی زمین سے ٹیکے چپ چاپ

کھڑا تھا۔

و فقط ارجمند کی ماں نے مژکران دونوں کی طرف دیکھا۔ ایک ساعت کے لیے انہیں پڑی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر چونکی اس نے مکرانے کی شدید کوشش کی۔ لیکن اس کی پچکی نکل گئی اور پھر پہ آنسو گزنس لگا۔
”دیکھ تو بیٹا۔“ وہ بھرا تی آواز میں بولا۔ ”میرے دوست تجھے سے ملنے آ ہے ہیں۔ دیکھ تو ادھر آ نکھیں تو کھول۔“
لیکن ارجمند اسی طرح آ نکھیں بند کیے پڑا رہا۔
وہ ایلی اور رضا سے مخاطب ہو کر بولی ”انتے قانپی سدھ بھی نہیں رہی۔ بس یوں ہی آ نکھیں بند کیے پڑا رہتا ہے۔ نہ خود بات کرتا ہے۔ نہ کسی کی بات سنتا ہے۔ آ و بیٹھ جاؤ۔ دیکھ لو اپنے دوست کا حال۔“

وہ دونوں چپ چاپ چوکیوں پر بیٹھ گئے ماں پھر سے اپنے بیٹے کی طرف گلکلی باندھ کر دیکھنے میں کھوگئی اور کواٹر پر ایک خوفناک خاموشی مسلط ہو گئی۔
نہ جانے کب تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔

رضا نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ ایلی غور سے ارجمند کی طرف گلکلی باندھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ اس میز پر پڑی جوار جمند کے سرمانے پڑی تھی۔ میز پر ایک سوتی سی مجلد کا پی تھی جس کے سرورق پر خوش خط حروف میں انگرایندی ماباؤں لکھا ہوا تھا۔ ایک طرف بانسری دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس کے قریب ہی ستی خوبیوں کی چند خالی شیشیاں تھیں اور اشعار کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑی تھیں اپنی انگرایندی پر یہ سند لیں پر یہم پتہ اور پونم ٹونا سے بے نیاز گوکل کے بن کا وہ کنہیا آ نکھیں بند کیے ہوں بے حس لیٹا ہوا تھا جیسے اس میں حرکت کی سکت نہ رہی ہو۔

اس منظر کو دیکھ کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چھینیں مار مار کر رو دے۔

و فقط ارجمند کو کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور اس کا سارا جسم کھانسی کی شدت سے

لرزنے لگا۔ سینے میں دھنکی سی چل رہی تھی۔ ہڈیاں چیختی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ماں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ بہن چونے بھرا پیالہ اٹھا کر پاس آ کھڑی ہوئی تاکہ اسے تھوکنے میں وقت نہ ہو۔ دیر تک ہڈیوں کا ڈھانچہ یوں ہلتا رہا۔ جیسے روئی سے بنا ہوا ہو۔ پھر اس نے منہ کھول دیا اور بستر پر خون کی پوچکارنی سی چلی گئی۔ ماں نے اسی لٹادیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں دیکھنے کی سخت نہ تھی ماں چلانے لگی۔ ”بیٹا وہ لیکھ تو تیرے دوست آئے ہیں۔“ مگر وہ جوں کا لتوں پڑا رہا۔

پھر ایلی اٹھ کر اس کے سامنے چارپائی پر جا بیٹھا۔ ارجمند۔ ”اس نے اسے آواز دی۔“

”ارجمند ارجمند۔“ ارجمند کی نگاہ میں ایک چمک سی ہبرائی۔

”میں ہوں ارجمند میں اور رضا بھی آیا ہے۔“ ایلی نے رضا کی طرف اشارہ کیا۔ ارجمند نے گردن موڑنے کی کوشش کی اپنی بے بھی محسوس کر کے اس کی آنکھیں پر نہمیں ہو گئیں۔

”کوئی بات کرانے سے بیٹا۔“ ایلی نے چلا کر کہا۔

ارجمند نے بعد مشکل اپنا ہاتھ اٹھایا اور یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو ”ٹھیک ہوں میں۔“

”کیا حال ہے تیرا۔“ ایلی نے چلا کر کہا۔

ارجمند نے بعد مشکل اپنا ہاتھ اٹھایا اور یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو ”ٹھیک ہوں میں۔“

”جلد جلد صحیت یا ب ہونا۔“ وہ بولا۔

ارجمند مسکرا دیا۔

دوروز انہوں نے وہاں قیام کیا۔ پلے دن تو ارجمندان سے کوئی بات نہ کر سکا مگر اگلی روز اس کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی تھی۔

”تم اچھے ہوں۔“ ارجمند نے اشاروں کی مدد سے ایلی سے پوچھا۔

”تم اپنی بات کرو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”مزے میں ہوں۔“ وہ بولا ”لیکن تم دیرے سے آئے ہو۔ بہت دیرے سے۔“ ارجمند نے رک رک کر کہا۔

”مزے میں ہوں۔“ وہ بولا ”لیکن تم دیرے سے آئے ہو۔ بہت دیرے سے۔“ ارجمند نے رک رک کر کہا۔

”کیوں اب لیا ہے۔“ رضا نے پوچھا۔

”اب۔ اب یہ وہ سوچ بیٹھ پڑ گیا۔“ اب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ تمہیں بندراں کوں دکھائے گا۔ اور اور وہ۔“ رک کیا۔

”اب سخرے یہ کیا ڈھونگ رچایا ہے ورنے۔“ رضا نے شرارت سے کہا۔

”ڈھونگ رچائے بنار ہے ہیں کبھی۔“ وہ بولا ”اماں ڈھونگ بھی نہ ہوتا ہو کیا۔“

”اب جلد ٹھیک ہو جنا۔ اور علی پور آؤ۔ بیاہ ہو رہے ہے ہیں وہاں۔“

”کپ کیپ کی سناؤ۔“ ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مری تو نہیں جا رہی اپنے فراق میں۔“

”تو شرارت سے کب بازاۓ گا۔“ رضا چلایا۔

”اوہہوں،“ ارجمند بولا ”بازاً ناپین کا کام نہیں۔“

وہ دونوں ہٹنے لگے۔

”وہاں جا کر بھی یہی کام کروں گا۔“ ارجمند نے کہا۔

”کہاں جا کر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہیں،“ وہ بولا ”بڑا امصار ہے گا وہاں۔“

”بکواس نہ کر۔“ رضا چلایا۔

”اوہہوں،“ وہ پہلا ”یہ بند نہ ہو گی۔“

دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر ایلی اور رضا انھے بیٹھے ”اچھا بہم جاتے ہیں۔“

”اوہوں۔“ ارجمند نے سر ہلا�ا۔

”پچھے دوکان اکیلی ہے۔“ رضا بولا۔

”ہمیں اب اجازت ہی دو۔“ ایلی نے کہا۔

ارجمند نے غورنے سے ان کی طرف دیکھا۔ اور جب ایلی رضا مصافیہ کرنے لگے۔ ارجمند کا ہاتھ پس نہ تھا میں تمام اتوس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر رخسار پر بہہ گیا۔

”دل برانہ کروار جی۔“ ایلی نے کہا ”پھر میں گئے۔“

ارجمند کی آنکھ میں عجیب تھی مایوس تھی۔ بے بنی بھری مایوسی۔

”اچھا خدا حافظ،“ رضا نے کہا۔ اور وہ دونوں چپ چاپ باہر تک آئے۔

شیشیں تک وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ ان کے دلوں پر بو جھ پڑا ہوا تھا۔

چاروں طرف اوسی چھائی ہوئی تھی۔ رضا بوجمل محبوس ہو رہی تھی۔ اور وہ رینگتا ہوا ویرانہ پھیل کر کیا لامتناہی ہوا جا رہا تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔

”کنویں سے پانی نہ پی لوں جھوڑا سا۔“ رضا نے کہا۔

”پی لو۔“ اور وہ دونوں کنویں کی طرف چل پڑے۔

کنویں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔

”بہن پانی پلانا ذرا۔“ رضا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ پانی پی کر وہ دونوں چل پڑے۔

کنویں پر عورتیں ان کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔

”کون تھے یہ؟“ کوئی پوچھ رہی تھی۔

ایک مرد کہہ رہا تھا۔ ”کارخانے میں کسی کے مہماں آئے تھے۔ وہ پتلا دبلا چھو کرًا

شہر والا۔۔۔

”اچھا وہ سودائی سا،“ ایک ہنسنے لگی۔

”ہاں ہاں وہی۔“

”ت ت ت ت ت ت بیچارہ۔“

ایلی کے روپروار جمند کھڑا مسکرا رہا تھا سمجھے ہواں کو کہتے ہیں لاج گوکل کی دیوبیاں لاج پال ہیں۔ جان جائے پر آن نہ جائے۔ اندر ہی اندر محبت کی آگ سے پھلک مریں گی۔ لیکن تک بات آجائے افہوں۔ وضھا ہے گوپیوں نے آج کرشن کنھیا کی بھی لاج رکھلی۔ کیا سمجھے۔ یہ رہ رہ رہ مرنی کا رسیا بانسر میں بجانے لگا۔

کنویں پر کھڑی وہ غیارہ نہیں رہی تھی۔ دوسری طرف ہی دیکھ دیکھ کر آنکھیں مٹکایا کرتا تھا اور چھریوں مرلی مرلی بجانے لتا جیسے بڑائیں کار ہو پر خاک بھی نہ بھتی تھی اس سے۔

کا کا کا کا ایس درخت پر بیٹھا ہوا کوایوں بولنے لگا جیسے کسی مرلی کے رسیا کی نقل اتنا رہا ہو۔

دور گاؤں کی چکی ہونک رہی تھی۔ اور کھیتوں میں کوئی ماہیا گا رہا تھا۔

”اساں گل تر و نجناں تساں راہ پے تکنے نی۔“

ان جانا تیاگ

دیر تک وہ دونوں شیش کے نخ پر اس رینگتے ہوئے ویرانے میں بیٹھے گاڑی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ وہ ایک بار رضاۓ بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ بات اس مسلط اور محیط ادا سی کے پھیلاویں میں یوں بے کار ہو کر رہ گئی تھی جیسے ریگستان میں پانی کی ایک بونڈ گر گئی ہو۔

پھر جب گاڑی کی گھنٹی بجی تو وہ چونکے۔ ”میں لکھ لے آؤں۔“ رضاۓ کہا۔
”صرف ایک لانا۔“ ایلی نے کہا۔

”ایک“ رضا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ ایلی نے رضا کی طرف دیکھے بغیر کہا ”ایک“

”کیوں؟“

”بس۔“

”تم کیا یہیں بیٹھے رہو گے باقی عمر“ رضا نے پوچھا۔

”خوبیں۔“ ایلی بولا۔

”تو پھر۔“

”میں علی پوری یہیں جاؤں گا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو کہاں جاؤ گے؟“

” لاہور۔“ ایلی سوچے سمجھے بغیر بولا۔ اس چھانی ہوئی ادا سی اور ویرانی نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا تھا۔ اس کی زگاہ میں شہرا اور اس کی تمام رنگینیاں عبث ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ محسوں کر رہا تھا جیسے اس نے ساری دنیا کو تیاگ دیا ہو۔ اور سادھوں کر باہر نکل آیا ہو۔

”لیکن۔“ رضا بولا۔ ” محلے میں تو اتنی شادیاں ہیں۔“

”شادیاں۔“ ایلی نے براسمنہ بٹایا ” ہونے دو۔“

”اور اور۔“ رضا نے پوچھا ” اور وہ“

”وہ۔“ ایلی نے تعجب سے پوچھا ” کون۔“

”کیا اسے نہ ملے گے؟“ رضا نے پوچھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ ایلی نے سمجھے بغیر آہ بھری۔

”اوہ تھا میری چھٹیاں۔“

”چھٹی ہی چھٹی ہے اب اور کیا۔“ ایلی بولا۔

”اوہ۔“ رضا خاموش ہو گیا۔ دریکہ وہ خاموش بیٹھے رہے۔

جب گاڑی آئی تو رضا نے ایک مرتبہ پھر ایلی کی منت کی۔ ” چلوا کٹھے چلتے ہیں۔“

”اوہ ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ رضا نے پوچھا۔“

”جو جی چاہے کہہ دینا۔ ایلی نے آہ بھری۔“

”وہ مجھ سے ناراض ہو گی۔“

”مجھ سے کوئی سُچنے خوش ہے وہ۔“ ایلی سمجھے سوچے بغیر باقاعدیں کیسے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ رضا اس کے متعلق بات کر رہا ہے۔ جس کے متعلق وہ کسی سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔
لاہور پہنچ کر ایلی یوں چار زبانی پر لیٹ گیا جیسے اس وسیع دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ جیسے دنیا میں ایک میرانہ ہوتی وہ قم میرانہ ہے۔
نیا بورڈنگ خالی پڑا تھا۔ لڑکے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے۔ صرف چند ایک انور وہاں یوں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے جیسے کسی پرانے قلعے میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔

چار روزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ اس کا ذہن ایک خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ علی پور شہزادیم نیم گویا اس کی زندگی سے معدوم ہو چکے تھے۔

کریسٹ ہوٹل

پھر آہستہ آہستہ کریسٹ ہوٹل میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ نئے ماحول میں کھو گیا۔
کریسٹ ہوٹل ریواز سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر شخص کو ایک الگ کمرا حاصل تھا۔ جب بھی وہ چاہتا اپنے کمرے میں جا کر لوگوں کو اپنی زندگی سے خارج کر سکتا تھا اور جب چاہتا کمرے سے باہر نکل کر بھیڑ میں شامل ہو سکتا تھا۔ اگرچہ بھیڑ میں شامل ہونے کی خواہش اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی اس کے بر عکس ریواز ہوٹل میں کمرے کے اندر اور کمرے کے باہر ہر جگہ بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس بھیڑ سے بچنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔ لیکن یہاں اس نئے ہوٹل میں کمرے سے باہر بھی بھیڑ نہ تھی۔

یہاں بہر بھی افراد تھے ایسے افراد تھے جو اس کی طرح از لی طور پر اکیلے تھے تنہا تھے۔
کریمنٹ ہوٹل میں پہنچ کر اس نے غالباً پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بیشتر افراد اکیلے اور
تنہا ہونے کی وجہ سے لوگوں کے شورو شغب سے دور بھاگتے ہیں یا بھیڑ لگاتے ہیں۔
کریمنٹ ہوٹل میں جا کر اسے تسلی ہو گئی۔ اب وہ دوسرے طالب علموں سے اس
حد تک نہیں ڈرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ بھیڑ لگانے والے خود احساس
تنہائی اور احساس مکتری سے عاجز آئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب وہ فست ایئر کا
نہیں بلکہ تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود کافی بیشتر پروفیسر اور لڑکے
اس سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔

بہر صورت اس نئے ہوٹل میں اسے تنہائی میسر تھی اور اس لیے ہوٹل کے لوگوں کی
نگاہیں اس کی آمد و رفت میں خل انداز نہیں ہوتی تھیں اسے چھیڑتی نہ تھیں اس پر تمثیر سے
ہنستی نہ تھیں۔ جب بھی ایسا پر شہزادی طاری ہو جاتی تو وہ اپنے کمرے میں جا گھستا اور
دروازہ بند کر کے چارپائی پر لیٹ کر بیٹی ہوئی باتیں از سر نو پینا شروع کر دیتا۔ یوں زندگی
کی ویرانی کو بر طرف کرنے کے لئے تھیل کا سہارا لیتا۔ اور جب اس سے بھی تسلیکیں نہ ہوتی
تو چپ چاپ اٹھ بیٹھتا، اور کسی سینما میں بیٹھ کر ایامو اور پیدا رو بہادر کے کارنامے دیکھتا اور
پھر واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر چارپائی پر لیٹ کر اپنی لیڈنگ لیڈی کو اس قید خانے
سے چھڑانے کی تجویز میں سوچتا تھیل میں ان تجویز کو عملی صورت دیتا۔ اس کی زندگی میں شہزاد
سے بڑھ کر کوئی عشرت نہ تھی۔

لیکن جب سے وہ ارجمند سے مل کر آیا تھا۔ یہ خوش نہیں پیدا کرنے کی کوشش میں
شدت سے لگا ہوا تھا کہ شہزاد کی بے پرواہی کے پیش نظر اس سے چند اس دچپی نہیں
رہی۔ اسے اس پر غصہ آتا تھا کہ جب شہزاد اس کی طرف سے اس حد تک بے پواہ ہو سکتی
ہے تو وہ اس کا تھاج کیوں ہے۔ اس کے دل میں شہزاد کے لیے اس حد تک نیاز کیوں

ہے۔ اس خیال پر اسے دکھا ہوتا اور اس دکھ کی کمک سے مخلصی پانے کے لیے وہ یہ اعتبار پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اسے بھی شہزاد چند اس پر و انہیں پرواتو تھی لیکن صرف اسی صورت میں

کہ شہزاد کو بھی اس کی چاہ ہو۔ وہ بھی اس کا انتظار کھینچے۔ وہ بھی اس کے بغیر نہ رہ سکے۔

کریمنٹ کے نئے ماحول میں اس اعتبار کو تقویت دینے کی کوشش کی۔

جونہی اس کی توجہ شہزاد کے بخوبی سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ بجاہ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

بجاہ اور جاہ

بجاہ کی مسکراہٹ میں تھی خیام کو نہ تھا۔ النا اس میں تو بلا کا خلوص ہمدردی اور اک ان جانی بے نام گرمی تھی۔ محبت تھی۔ ایسی محبت نہیں جیسی اسے شہزاد سے تھی جو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ بلکہ ایک ایسی گرمی جس کے تحت سکون ملتا ہے۔ تھنڈی مٹھاس بھری مدد گرنی۔ بجاہ وصول کو کڑی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ الثا وہ تو نگاہ ہیں جہاں کا لیتا تھا اور پھر بن دیکھے وصولے کے قرب کو محسوس کرتا اور مسکراتا جیسے کہہ رہا ہو میں جانتا ہوں۔ میں تمہاری مشکلات کا حل ہوں۔ میں تمہاری آماجگاہ بن سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو۔ ورنہ کوئی بات نہیں۔

بجاہ کی عادت تھی کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا تھا۔ دن میں کئی مرتبہ وضو کرتا۔ اکثر نماز پڑھتا نظر آتا اور ہاتھ دھونا تو اس کا مسلسل شغل تھا۔ اسے ہاتھ دھونے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سمجھتا ہو کہ اس کے ہاتھ کبھی صاف نہیں ہو سکتے۔ اگر چوہ دیکھنے میں شیشے کی طرح صاف اور چمکدار تھے پھر نہ جانے کیوں بار بار بجاہ کی توجہ ہاتھوں کی طرف مبذول ہو جاتی اور وہ کہتا ”اچھا تو میں ذرا ہاتھ دھولوں۔“ ہاتھ دھونے کے بعد دریتک وہ اپنے صاف سترے ہاتھوں کو تو لیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا رہتا۔

بجاہ کی طبیعت میں مٹھاس کے علاوہ ایک نظم بھی تھا۔ اس کی ہر بات قادعے کے مطابق ہوتی۔ ہر کام پر گرام کے تحت سمجھیل پاتا تھا۔ نظم کے اس شدید جذبے کی وجہ سے

لوج اسے الیکٹریک اسونپ دیا کرتے جو باقاعدگی اور سلسلے کے بغیر سرانجام نہیں دینے جا سکتے اور جو مسلسل توجہ چاہتے ہیں۔ اگر کسی کا پن خراب ہو جاتا تو وہ اسے بجاہ کو دے دیتا۔ ”بھایہ ذرا دیکھنا تو اس قلم میں کیا گڑ بڑھے۔“ اگر کسی کی گھری صحیح وقت نہ دیتی ہو تو وہ بھی بجاہ کو سونپ دی جاتی۔

الیکٹریک چیز بجا کو دینے ہوئے تا کید توجہ یا احتیاط سے متعلق بدلایات دینا بالکل عبث تھا۔ چیز بجا کو دکھانا ہی کافی تھا۔ ”بھایہ ذرا دیکھنا۔“ اور پھر بجا کی تمام تر توجہ اس پر مرکوز ہو جاتی۔ اس حد تک کہ وہ ہر وقت اسے اٹھانے پہرنا اور راہ چلتے یا فر صحت کے وقت بیٹھے ہوئے اسے ٹھیک کرنے میں شدت نصے معروف رہتا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی تو دفعتاً اس چیز سے بجا کی دلچسپی ختم ہو جاتی۔

بجا کو ٹوٹی یا بگڑی ہوئی چیزوں کو بنانے سنوارنے سے دلچسپی تھی۔ لیکن ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود ایک ٹوٹی ہوئی چیز ہو۔ لیکن اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کی اس نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اسے بننے سنوارنے سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے مٹی کا دیا ہو جو مدھم لو جل رہا ہو۔ بجانے کبھی بھڑک کر جانے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی شخصیت اس فروعی چمک سے عاری تھی جو کالج کے لاٹ کے انپی طرف توجہ منعطف کرنے کے لیے پیدا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

ویسے بھڑک کر جانے کی خواہش جاہ میں بھی نہ تھی بندیا دی طور پر وہ بھی جھونپڑے ہی کا چڑاغ تھا۔ لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سی جھجھک تھی۔ وہ ہر نوار دی آمد پڑھنچ کر رہ جاتا۔ پیشانی پر تیوری چڑھ جاتی ہونٹوں پر تحقیر کی ہلکی سی لرزش پیدا ہوتی۔ اور پھر وہ گویا ریشم کے کپڑے کی طرح اپنے کوئے میں گھس جاتا۔ لیکن اس عمل کی وجہ سے اسے کوئے میں لیٹھ رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اور بسا اوقات وہ تنہائی میں بھی بے حصی اور بے پرواہی کے خول میں دبکا بیٹھا رہتا۔ لیکن کبھی کبھار اس کی حقیقی شخصیت کی مختصر سی جھلک ایک رنگیں اور رنگیں محبت بھری مسکراہٹ کی صورت میں ہو یہاں ہوتی جیسی برکھارت میں بادلوں میں

سے سورج کی شعاعیں بھری مسکراہٹ کی صورت میں ہو یہاں ہوتی جیسی برکھارت میں بادلوں میں سے سورج کی شعاعیں پھوٹ لگتی ہیں اور ایک ساعت کے لیے منظر پر نگین دھاریاں دکھائی دیتی ہیں۔

جاہ کے اس جھجک اور ڈر کا بظاہر کوئی جوان دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کی شدت سے ظاہر تھا کہ یہ نقوش کسی شدید ہنگی طوفان کے چھوڑے ہونے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کا دھارا خارجی سمت کی طرف بہنے کی بجائے داخلیت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اور اس طرح وہ اپنی ہی آنا کا جنوبہ بنایا کہ اس میں دیکیاں کھارہا تھا۔

کتاب میں

خارجیت سے ہٹ کر جاہ کی وجہ کتابی دنیا کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور اس کتابی دنیا نے حقیقی دنیا کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہو جیتا تھا کتابی کرواروں سے جھجکے بغیر ملتا تھا۔ ان سے تعلقات پیدا کرتا تھا اپنے اروگروان کی بحیرہ لگا کر بیٹھ رہتا تھا کریںٹ ہوش میں ایلی کے لیے بجاہ اور جاہ دوناہ گاہیں تھیں۔ اس لیے روز بروز وہ ان دونوں بھائیوں کے قریب تر ہو گیا۔ ایک تو ان دونوں کے کیوبیکل ایلی کے کمرے کے پاس ہی واقع تھے۔ دوسرے وہ دونوں طفر اور تمسخر سے عاری تھے اور ان میں دوسروں کا نہادی اڑانے کی حادث نہ تھی۔ ان سی مل کر ایلی کا احساس مکتری ابھرنے کی بجائے دب جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جاہ سے ایک بعد سامحسوں کرتا۔ جاہ کی بظاہر سردمہری ایلی میں جھجک پیدا کرتی تھی۔

جب بھی ایلی جاہ کے کمرے میں جاتا تو وہ یوں سراٹھا کر اس کی طرف دیکھتا جیسے پوچھ رہا ہو۔ تمہارا یہاں آنے کا مطلب؟ جاہ کے ماتھے پر تپوری چڑھ جاتی۔ ایک ساعت کے لیے وہ ایلی کی طرف دیکھ کر گھورتا اور پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا اور ایلی جاہ کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود تنہارہ جاتا۔ ابتدا میں تو ایلی جاہ کے اس رویے پر گھبرا جاتا تھا اور کچھ دور جاہ کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد چپکے سے وہاں سے کھک آتا۔ لیکن

آہستہ آہستہ وہ جاہ کی اس عادت سے مانوس ہوتا گیا۔ مانا کہ جاہ کی بے رثی اور بے پرواںی وہ تھی لیکن دوسرے لڑکوں کی طرح اس کی نگاہیں ٹھوٹی تو ن تھیں اور جب بھی وہ جاہ کی بے حسی سے گھبرا جاتا تو آزادانہ طور پر وہاں سے اٹھ کر آ سکتا تھا۔

جاہ نے بھی اس سے نہ پوچھا تھا کہ تم جاہ ہے جو یا تم کیوں یا کہاں جا رہے ہو۔ باہر برآمدے میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے بغیر بھاگتا۔ ”میلی۔ آؤ یا مر میں تو اس گھری کے چکر میں پڑا ہوں نہ جانے کیا خرابی ہے۔ یہ ٹھیک وقت نہیں دیتی۔ وہ سعید ہے نامونا۔ چوہدری کرم دین کا میٹا اس کی ہے یہ گھری۔ کیا وقت ہوا گا بھی اور یہ تو چار نج گھے۔ اچھا تو میں وضو کروں۔“ جاہ ٹھنک کر اس کی طرف دیکھتا اس کی نگاہ میں شکوہ اور اعتراض نمایاں ہوتے اور یہ بھرپاتت کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا تھا کہ اسے احساس ہی نہ رہتا کہ کوئی شخص کرے میں بیٹھا ہے۔

جاہ کا کمرہ کتابوں اور رسائل اور تصاویر سے بھرا رہتا تھا۔ ہر ماہ کتابوں اور رسائل کا ایک نیا گلھا آ جاتا۔ اور جاہ ان کے مطالعہ میں کھو جاتا۔ صبح سے شام تک جاہ کو ان کتب اور رسائل کے علاوہ کسی چیز سے دچپی نہ تھی پڑھتے پڑھتے وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔ ”خوب خوب“ وہ کویا اپنے آپ سے کہتا۔ ”یہ شخص بھی عجیب مسخر ہے ہی ہی ہی۔“

ایلی ہنسنے لگتا۔ کون مسخر ہے ایلی کی موجودگی کو محسوس کر کے دھنعتا جاہ کا انداز بدل جاتا کون مسخر ہے جاہ وہرتا ”ہوں ہوں“ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پھر سے کتاب میں کھو جاتا اور پھر کچھ دری کے بعد آپ ہنسنے لگتا۔ ”جروم کے جروم بھی عجیب ہے، عجیب ہے، عجیب ہے۔“ انگلیاں پٹختا تھے ہوئے جاہ مدد گم آواز میں بولے جاتا اور پھر سے بھول جاتا کہ اس کے کمرے میں کتابوں کے شلف کے قریب کوئی بیٹھا ہے ایلی وہاں بیٹھ کر کوئی کتاب یا رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور چپ چاپ ورق گردانی میں مصروف رہتا۔

اس سے پہلی ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ کتاب کو کالج یا امتحان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر

بھی پڑھا جاسکتا ہے جاہ سے مل کر اسے پہلی مرتبہ کتاب کا احساس ہوا۔ پہلی مرتبہ اسے کتاب کی ورقگردانی کا موقعہ ملا لیکن اس کے باوجود کتاب کے نفس مضمون کی اہمیت کا اسے احساس نہ تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ جاہ اپنے کمرے میں ایلی کی موجودگی کے احساس سے مانوس ہوتا گیا لیکن اس سے باوجود طنز بھری نگاہ جوں گی توں قائم رہی اس کی بے اعتمانی کچھ بڑھ گئی لیکن اس کے ساتھ آشنا اور سرت کے ان لمحات کی تعداد بھی بڑھ گئی جب وہ اپنے کو نے سے باہر نکلتا تھا۔ رنگین بخور

علی پور سے آنے کے بعد ایک ہی بار بیانی کے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھر آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزاد کے خیال کے بخور سے نکل جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شہزاد کا سحر اس حد تک مسلط اور صحیط ہو چکا ہے کہ اس سے بچاؤ ممکن نہیں لیکن شہزاد کی بے پرواںی کی وجہ سے اس کے دل میں ایک کرب پیدا ہوتا تھا ایک ایسا کرب جو اس کی روح کو یوں بلوتا جیسے وہی کا ایک برتن ہو بسا اوقات سوتے وقت جب اسے شہزاد کا خیال آتا تو اس کے ذہن میں شہزاد کا بھرے ہوئے تاروں سے بھرا ہوا نقاب آ جاتا اور وہ ان ابھرے ہوئے تاروں کو گنتا۔ اس وقت ایک گوشت کا لوٹھرا اغافوفر کی شکل اختیار کر لیتا۔ ”ہی ہی ہی“، قہقهہ مار کر ہنستا ہنستے ہستے اس کامنہ بات کا رنگ اختیار کر لیتا۔ بازو اور نگل میں کٹ جاتیں اور وہ چلاتا۔ ”ایلی تم ایلی۔“ ایلی کی نگاہ تلے اس وقت وہ اندھیری بند بیٹھک ابھر آتی بیٹھک کے وسط میں آب زم زم کی ایک جھیل ابھرتی اور جھیل میں سے شہزاد نکال کر کھتی ایلی تم۔ اس وقت شہزاد کے انداز میں طنز یہ تمسخر کا ایک طوفان کھولتا اور ایلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ پھر گوشت کا ٹنڈ منڈ لوٹھرا قہقهہ لگاتا ”تم۔ تم۔“

اس وقت مختلف شکلیں ایلی کے رو برو آ کرنا چھیں گاتیں بھیڑیے کی کھال اتر جاتی اور اندر سے علی احمد ہنستے ”شہزاد یہ تم کیا بچوں کو اکٹھا کر کے بیٹھ رہتی ہو کبھی ہمارے ہاں

بھی آؤنا کیا کہتی ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ ”

تھیڑ کا پردہ اٹھتا اور صدر ایک ڈرماں انداز سے داخل ہو کر کہتا۔ ”ایلی ایلی میری طرف دیکھو ایلی میں بھیں رہتا ہوں اس نگین چوبارے کے نیچے میں یہاں دلیز پر پڑا ہوں کبھی مجھے بھی مل لیا کرو۔ بھی مجھے بھی مل لیا کرو کبھی مجھے بھی کبھی۔۔۔ ” پھر وہ گانے لگتا۔ ” اے دلب ہوں میں فدا۔ ” گاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گلابی پھوار پڑنے لگتی پیشانی پر دیواروں ہو جاتا۔ اور گاتے ہوئے شہزادی کی طرف مسکرا دیکھتے ہوئے وہ سُنج سے باہر نکل جاتا۔

پھر سہز ادا نہ بھتی اور رنگ کھول کر سفید پھول ادار دو پٹے کے کر کہتی۔ ” ہاں ہاں مجھے جانا ہے۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ میں جاؤں گی۔ میں جاؤں ہوں۔ ” اور گوشت کا توہراً تھیقہ لگاتا۔ ایک مسکراتا اور علی احمد ہنستے ” ہی ہی ہی۔ ” اور ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ سب اس پر نہ رہے ہوں اور شہزادی پر وہ ان کے ساتھی ہوئی ہو۔ ساری رات ایلی کروٹیں بدلتا آئیں بھرتا۔ وہ شدت سی کوشش کرتا کہ ان خیالات کو اپنے دامن جھٹک دے لیکن ان خیالات سے مغلصی پانہ اس کے بس کاروگ نہ تھا۔ اس روحاںی کرب کی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ شہزادی گرفت سے نکل جائے لیکن اس کے ساتھی شہزادے کے تصور کی رنگینی شہزادی کی جاذبیت اور شہزادی تھیڑ کی عظمت بے پناہ کیف کے حامل تھے۔

صحح کے وقت شہزادے سحر سے بچنے کے لیے وہ جاہ کے کمرے میں جا پناہ لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس نے جاہ کی سر دہری اور بے رخی کو گوارا کر لیا تھا۔ جاہ کی شکوک بھری نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے ان رسائل اخبارات اور کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی تھی جن کا جاہ کے کمرے میں ڈھیر لگا رہتا تھا۔ ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ مطالعہ امتحان کے خیال سے ہٹ کر بھی ممکن ہے پہلے پہل اس کی توجہ تصاویر کی طرف مبذول ہوئی تھی اور تصاویر کا تفصیلی مفہوم سمجھنے کے لیے اس نے ان کے نیچے لکھے اشارات پڑھنے شروع کر دیئے تھے پھر آہستہ آہستہ اس کی توجہ رسائل کے مضامین کی

طرف مبذول ہو گئی تھی۔

ایلی کو کتابوں اور رسالوں کی طرف متوجہ دیکھ کر جاہ کی سر دہری تمثیل میں بدل گئی۔ ”تم یہ رسالہ پڑھ رہے ہو کیا۔ انہوں کتاب کو یوں نہ موڑو۔ پہلے کتاب پڑھنے کا سیلہ سیکھو یہاں اور جریدہ یہ دنیا کے عظیم نقوش کا مجموعہ ہے اسے دیکھ کر تم کیا سمجھو گے۔“

لیکن ایلی کے لیے جاہ کی باتیں ہاتھی دانت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگر چوہ باتیں تلخ تھیں لیکن تلخ ترقائق کی یاد ایلی کے دل سے محو کرنے کا ذریعہ تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ ایلی کی ہٹ دہری کی وجہ سے ان کے قرب کے بحاثت برہتے گئے۔ کتاب کے مطالعہ سے تھک کر دفعتاً جاہ ایلی کی طرف دیکھتا ہے۔ ”تو تم پر ژنڈر سل کا مضمون پڑھ رہے ہو۔ ابھی چیز ہے۔ بڑی دیر کے بعد رسول نے اپنے انداز کی چیز لکھی ہے۔ معلومات کا ایک پتارہ ہے یہ شخص خدا ہو گئی۔“ یہ کہہ کروہ رسول کے متعلق ایک لمبی چوڑی تقریر جھاؤ دیتا ہے ایلی حیرت سے سنتا۔ وہ اس وقت یوں منہ کھولے بیٹھا ہوتا کہ دفعتاً جاہ رک جاتا۔ ”اوہ تم.....؟“ وہ انگلیاں جھکاتے ہوئے چلاتا اور پھر وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ”تم میاں تم کوئی سیدھی چیز شروع کرو کوئی داستان کوئی کہانی اور بھی میں فیلڈ کی نہیں وہ تو اشاروں میں بات سمجھاتی ہے پلو مار کے دیا بجھاتی ہے کیا چیز لکھتی ہے۔ واہ واہ واہ،“ اور پھر یوں ساکت و جائد ہو جاتا جیسے پتھر کا بنا ہو۔ اور ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا دیکھے جاتا جاہ کی باتیں سن کر ایلی کو دفعتاً یہ احساس ہوتا جیسے کوئی کنوں کا مینڈک پھدک کر سمندر میں جا گرا ہو۔ جاہ کی میں فیلڈ رسول والز فرا ایڈ شا اور برگسان کی دنیا عجیب دنیا تھی اور ایلی کے لیے یہ دنیا جاہ کے مرکز کے گرد گھومتی تھی۔

پھر جب ایلی واپس اپنے کمرے میں پہنچتا تو چھن سے شہزاد آسن جما کر سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ”کس بات پر بگڑے ہو مہاراج وہ پوچھتی۔ کب تک غیر حاضر ہو گے۔ کب تک پناہ گا ہوں میں چھپے رہوں گے کب تک مانوزا میں کھو ہے رہو گے میری طرف دیکھو مانوزا میں ہوں میں۔“

اس کے چہرے پر ایک پا سرا مسکراہٹ جھلکتی ”دیکھوں۔ یلدرم نے میرے بارے میں لکھا ہے ماتھے پر بندی آنکھ میں جادو،“ اس وقت شہزاد کے ماتھے کائل نک سے یوں روشن ہو جاتا جیسے بجلی کا ہندہ ہو۔ اور آنکھیں ناچھیں اور رسیل والزشا اور فیس فیلڈ ازروئے اور ایک طرف قطار لگا کر کھڑے ہو جاتے اور پھر چکے سے ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل جاتے اور شہزادوں ہاں اکیلی رہ جاتی اور اس کی شخصیت و وحشیوں میں بٹ جاتی۔

ایک طرف میڈونا کا بھال اس کے گرد بالہ بنادتا اور دوسرا جانب ڈائنا کا خیال۔ اس میں وقار بھر دیتا۔ اور ایلی محسون کرتا جیسے وہ سگ لیا ہو اور وہ دم ہلاتا ہوا ڈائنا کے قدموں میں جائیٹھتا۔

رازی اور زو

ایک روز جاہ کے کمرے میں کیوپڈ اور سائیکی۔ بولا گذ آؤٹ، رینس ڈی مائیلو کی تصاویر دیکھنے کے بعد جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اور لحاف لے کر لیٹا اور حسب معمول چھن سے شہزادوں پر آ کھڑی ہوئی تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ارے کیا شہزاد کے ناج میں اوپر پیدا ہو گئی۔ وہ اٹھ کر سننے لگا۔ چھن چھن گھنٹھرو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی واقعی ناج رہا تھا۔ ایلی ڈرگیا۔ کیا اس کے حواس اس حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ اس کے تھیل کے ساتھ آواز کا عنصر کیسے شامل ہو گیا تھا۔ یا وہ ناج کسی مشکلم فلم کا ایک نکلا تھا۔

اس زمانے میں متحرک تصاویر نے ایک نیا روپ بدلا تھا۔ انہی دنوں چھڑا یک ایسی نئی تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی جو پرانی تصاویر کی سیریل قسم کی نتھیں بلکہ کہانی ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ ایک کہانی کئی ایک نشتوں میں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ ایک کہانی کئی ایک نشتوں میں ختم ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی کے صرف تین ایسی سوڑو کھائے جاتے تھے اور ہر کہانی عموماً پندرہ یا بیس ایسی سوڑو مشتمل ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی ختم کرنے کی یہ نئی

تحریک فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک انوکھی بات تھی۔ اور فلم سازوں نے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ان مختصر فلمی کہانیوں کے ساتھ ایسے ریکارڈ بھیجنے شروع کر دیئے تھے جو کہانی کے مناسب مقامات پر مناسب صوتی اثرات پیدا کرتے تھے۔ مثلاً بن حور فلم میں بھری لڑائیوں کے مناظر کے ساتھ ساتھ روپوں اور طبل جنگ کی آوازیں اور پس مشترکی موسيقی یہ صوتی فلیاں فلم دیکھنے والوں کے لیے عجیب تھیں۔ انہی دنوں میں جاہ کے ساتھ ایسی نہ روایت ایسے فلم دیکھنے تھے۔ فلم دیکھنے میں جاہ کو بھی دچپی تھی لیکن جاہ چونکہ تمام زاہد روپوں کی کلتائیں اور سائل خرید کر لیتا تھا اس لیے روز فلم چل رہا ہے اور میرے پاس صرف آٹھ آنے دیں۔ وہ آٹھ آنے میں سے اھا کر کہتا "اگر دیکھنا ہو تو چلو میرے ساتھ۔"

اور وہ دنوں چپکے سے پیلس سینما کی طرف چل پڑتے جو میکلوڈ روڈ کے کوئے پر نیانا بنا تھا۔ اکثر وہ دنوں بہت لیٹ پہنچتے جب کہ چار آنے والے درجے کی تمام سیٹیں بھر چکی ہوتیں۔ اور وہ حسب معمول اندر ہیرے میں چلتے چلتے ہال کی دوسری دیوار کے قریب پہنچ کر بندوروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ وہ حسب معمول سینما میں لیٹ پہنچتے اور حسب معمول سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے اور انہوں میں جب بتیاں جاتی تھیں تو اسی نے دیکھا کہ چار آنے کے درجے کی تمام سیٹیں خالی تھیں اور ہال میں گندمیاں بیجنے والے انہیں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ دیکھ کر نہ رہے تھے۔ "اے،" ایلی چلاتا۔ "جاہ سیٹیں تو تمام کی تمام خالی پڑی ہیں۔" "اچھا۔ جاہ اپنی بے اعتمانی سے کہتا تھا اور پھر اپنے خیال میں کھو جاتا تھا۔ جیسے سیٹوں کا خالی ہونا اور ان کا سیڑھیوں پر بیٹھنا کوئی قابل توجہ یا غور طلب امر نہ ہو۔

"تو چلو وہاں چل بیٹھیں۔" ایلی نے کہا تھا اور اس نے منہ بنا کر شانے جھنک دیئے تھے اور جوں کا توں بیٹھا رہا تھا۔

ہاں تو اس روز اپنے کمرے میں گھنگھروں کی آوازن کرا یلی چونک پڑا اس نے

محسوس کیا جیسے فلم کی طرح اس کے تختیل کے ساتھ بھی کوئی ایسا ریکارڈ چل رہا تھا۔ لیکن بورڈنگ میں گھنگھرو..... وہ اٹھ بیٹھا اپنے کیوبیکل کا دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی بتیاں بھی ہوئی تھیں۔ لیکن گھنگھروں کی آواز وضاحت سے سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سریا مگر مدم مسلم سازخ رہا تھا۔ دریتک وہ کھڑا اس آواز کو سنتا رہا اور پھر اس کے کھون پیس چل پڑا۔

آواز کون کے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ کون کے کمرے کے قریب جا کھڑا ہوا اور باہر کھڑا ساز سنتا رہا۔ اس کا جل تو چاہتا تھا کہ دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھیا اور دروازہ کھلکھلا کر اندر واصل ہو جائے مگر اس میں ہملت نہ پڑی۔ اس لیے وہ وہیں بٹ بنا کھڑا رہا۔ وہ ساز کس قدر سریا اپنے امروہن کس قدر جاذب پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ گھنگھرو۔

دنگا کمرے کا دروازہ کھلا کوئی شخص باہر نکلا۔

”کون ہوتم؟“ وہ بولا

”میں میں۔“ ایلی گھبرا گیا۔ ”میرا نام الیاس ہے۔“

”اوہ،“ نووار دنے ماچس چلانی۔

روشنی میں ایلی نے اس کا چہرہ دیکھا اور کہم گیا۔ اس کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے جبشی ہو۔

”یہیں کے ہونا ہوٹل کے۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”لو بھی پھر اندر کیوں نہیں آ جاتے۔ چلو۔“ وہ ایلی کو گھونے لگا۔ اس کا قہقہہ سن کر ساز اور گھنگھرو بجا بند ہو گئے۔ ”کون ہے بھی ذو۔“ اندر سے آواز سنائی دی۔ ذو نے دروازہ کھول کر اندر رجھا نکا۔

”لڑکا ہے بورڈنگ کا۔“ وہ بولا ”باہر کھڑا اس رہا ہے۔“

”کون ہے۔“ پھر آواز آئی۔

ایلی مجرموں کی طرح کمرے میں جھانکنے لگا۔

”جی میں ہوں الیاس۔“ وہ بولا۔

”تمہیں دیکھا نہیں کبھی میاں۔ اس نے پوچھا۔

”جی میرا تمپر مترا ہے۔“

”سترا۔“ وہ غصے لگا۔ ”یہ ساتھ والا کمرہ۔“

”جی ہاں۔“ الیاس بولا۔ ”یہ ساتھ والا کچور کروں۔“

”اچھا،“ اس نے حیرت انہی کہا۔

”اُرے یہ جاہ کے ساتھ پھر اکرتا ہے۔“ وہ بولا۔

”تم چپ رہو جی۔“ اندر والے نے پھر ذوق و فوٹا۔ ”آ جاؤ بیٹھ جاؤ۔ لیکن اب بات بتا دو میاں میاں کے سی آئی ڈی تو نہیں ہو۔“

”میاں میاں کے سی آئی ڈی۔“ ایلی نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔ ”میں نہیں سمجھتا۔“

”پھر ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ اندر والے نے کہا ”بیٹھ جاؤ۔“ اور ایلی چپ چاپ کمرے میں بیٹھ گیا۔

”میرا نام رازی ہے۔“ وہ بولا اور ”یہ حضرت ذو ہیں۔“

رازی ایک دبلا پتلا خوبصورت لڑکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی جاذبیت تھی پیشانی فراخ تھی اور خدو خال نہایت موزوں اور تنکھے تھے اس کے سامنے ایک پاؤں کا ہار مونیم رکھا ہوا تھا۔ اور سامنے کونے میں بچھے ہوئے کمبل پر طبوں کی جوڑی پڑی تھی۔

ایلی نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا لیکن کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ایلی کو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ طبلہ اور ہار مونیم تو ٹھیک تھے لیکن وہ رقص وہ رقصہ کیا ہوئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسی لیے جھجک رہا تھا کہ نہ جانے اندر کون یہ

اور اب اندر رواصل ہونے کے بعد اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رازی نے بڑے اطمینان سے باجہ بجانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی پیاری دھن بجا رہا تھا ذوزٹبلے کی جوڑی کے قریب کمبل پر چادر میں لپٹا ہوا جھوم رہا تھا جیسے حال کھیل رہا ہو۔
چمن دفعاً گھنٹھر و بجا اور نے ایلی کے دل سے کویا ایک حق سی نکل گئی۔ ”یہ اواز
کہاں سے آئی۔“ چمن چھٹا چمن۔ گھنٹھر و پھر بیج۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف
نظر دوڑا۔ ”لیکن وہاں رازی اور ذوزٹ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔“ شاید اسے چار پائی تلے چھپا
رکھا ہے۔ ایلی نے سوچا ”لیکن چار پائی تلے ناچتا کیسے ممکن ہے۔“
دفعاً ذوزٹ نے کویا ایک چنگا رہا۔ علی اور چادر پام پھینک کر وہ طبلے کی جوڑی پر پل
پڑا۔ وہاں گدی گھنا، وہاں گدی گھنا۔ وہاں گدی گھنا۔ ارے وہ چونکا۔ چمن چھٹا نانا چمن رقصہ گویا چار پائی تلے سے نکل کر
میدان میں آ گئی۔

”شہابا ش بیٹا۔“ رازی ذوزٹ کی طرف دیکھ کر چلا یا۔ کمرے میں موسیقی کی لہروں کا ایک
ٹوکان المآیا اور ایلی کے رہے سہے حواس بھی معطل ہو گئے۔

جی کے اور ایم کے

ذوا اور رازی سے متعارف ہونے کے بعد ایلی کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔
سارا دن وہ جاہ کے کمرے میں رسائل اور کتابوں کے صفحات اتنا پلتارہتا یا جاہ کے پیکھر
ستایا شام کے وقت وہ دونوں سینما ہال کی سیٹر ہیوں پر بیٹھ کر فلم دیکھتے اور رات کے وقت
چپکے سے رازی کے کمرے میں جا پہنچتا اور وہاں بیٹھ کر گانستارہتا۔

یہ مشاصل اسے اس لیے پسند تھے کہ ان میں مصروف ہو کر وہ شہزادی دسیس سے دور
ہو جاتا تھا یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ مشاصل شہزادوں کے سامنے لاکھڑا کرتے تھے۔

جاہ کے کمرے میں رسائل دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ کسی نہ کسی ایسے مشہور عمل پر پڑ جاتی
جسے دیکھتے ہوئے انجانے میں شہزاد کے ساتھ مناسبت کے اجرتی مونا لزا کو دیکھتا تو اس

کے ہنٹوں کے کونوں میں شہزاد سکراتی و نیس کو دیکھ کر شہزاد کے جسم کے پیچ و خم ابھرتے۔
کیوں پڑا اینڈ سائیکلی کو دیکھ کروہ محسوس کرتا جیسے شہزاد اپنی شریر آنکھیں مومندھ کر بیٹھ گئی۔ اور
رازی کے کمرے میں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا جیسے ہن کے ساتھ شہزاد نماج رہی ہو۔

ان کے علاوہ اس کے دونے دوست بنے تھے تاک ہی تاک اور جلتی آنکھیں تاک
ہی تاک مشن کالج کا طالب علم تھا۔ جوان دونوں ایم اے ریاضی میں تعلیم پاتا تھا۔ ایلی کو
اس سے جاہنے متعارف کیا تھا۔ ایک روز جب وہ دونوں ولڈگریٹ پینٹنگز کا نیا شمارہ
دیکھنے میں شدت سے مصروف تھا تو ایلی نے کہا۔
”یہ تصویر تو فریم کرنے کے قابل ہے۔“

اس پر جاہ بولا ”ہاں ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔“ اور پھر گھری سوچ میں پڑ گیا۔

اس روز شام کو سینما جانے کی بجائے وہ دونوں مشن کالج کے بورڈنگ میں جا پہنچے۔
اندر جا کر جاہ اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک پنلا دبلاڑ کا مطالعہ میں مصروف
تھا۔ ”یہ جی کے ہے۔“ جاہ نے کہا ”اور یہ ہمارے دوست الیاس صاحب ہیں۔“ یہ کہہ کر
وہ الیاس صاحب کی موجودگی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ ”ہم اس لیے آہے ہیں۔“ جاہ بات
کرتے ہوئے رک گیا۔

”وراصل میں سوچ رہا تھا کہ جو ولڈگریٹ پینٹنگز جریدے کی صورت میں آ رہی
ہیں آج کل تم نے تو دیکھ ہی نہیں وہ۔“
”نہیں تو۔“ جی کے نے جواب دیا۔

”میں سوچ رہا تھا اگر ہم انہیں فریم کر لیں تو کیسا رہے۔ بازار سے تو بات نہ بنے گی۔
خود کیوں نہ فریم بنائیں۔“

”ٹھہرو۔“ جی کے نے گویا اپنی تمام تر توجہ تاک پر مرکوز کر دی۔ اس کی تاک لمبی اور
چونچ دار تھی۔ انداز میں بلا کی پھرتی تھی۔ اور ذہانت میں تیزی تھی۔

جی کے قاعدے اور اصول کا آدمی تھا۔ وہ قاعدوں اور اصول میں سوچتا تھا۔ خشک اور

کوری دلیلیں دینے کا عادی تھا۔ دوسروں کو خشک اصولوں پر پر کھنے کا متواہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں بنیادی طور پر حزن و ملاں کی گہرا ای جھلکتی تھی۔ چہرے سے غم خوری پیکتی تھی لیکن وہ اپنے آپ پر خوشی اور انہما طے کے شدید لمحات طاری کر سکتا تھا۔ اور اپنی بے پناہ ذہانت کے بل بوتے پر نہایت پیکیلی اور جاذب و قبیلی باقیتیں کرنے کا اہل تھا۔

”مُهْبَرُو۔“ کہہ کر جی کے یوں سوچ میں پڑ گیا جیسے کوئی بیوپاری لین دین کے حساب میں کھو گیا ہو۔ دیر تک اپنی ناک کو کھو رہتا اور پھر سر اٹھا کر کہنے لگا۔ ”ہاں چلے گا ضرور چلے گا۔ نومن تیل کے بغیر راڈا ناچے گی۔“

”اچھا۔“ جاہ نے بچوں کی طرح تالی بجائی ”وہ گیئے۔“

”سانچے ہم خود بنائیں گے۔“ وہ بولا۔ ”آری مل جائے گی۔ بس فریم کی لکڑی شیشہ اور کیل خریدنے پڑیں گے۔“

”اگر کچھ خریدے بغیر فریم بنا سکیں ہم تو بہتر نہ ہو گا۔“ جاہ نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جی کے کی ناک اور بھی لمبی ہو گئی۔

”چلو یہ دھندا ابھی طے ہو جائے۔ جاہ اٹھ بیٹھا اور وہ تینوں انارکلی کی طرف چل پڑے۔ جب وہ واپس آئے تو جی کے کے کمرے سے باہر برآمدے میں ایک لڑکا بیٹھا تھا۔“

”اے، جی کے چلایا“ اپنے آپ ہی کھیل رہے ہو۔“

”تمہیں اعتراض ہے کیا،“ وہ چمک کر بولا

”ہم نے تو سنا تھا میاں“ جاہ نے کہا ”کہ یہ کھیل دو کے بغیر نہیں کھیلا جاتا۔“

”سنی سنائی بات کا کیا بھروسہ“ لڑکا بولا

یہ میرا دوست ایم کے ہے۔ جی کے نے ایلی سے کہا ”بڑے معز کے کا آدمی ہے۔“

دو کا کھیل اکیلا اکھیلتا ہے۔ اکیلے کے کھیل کے لیے ساتھی ڈھونڈتا ہے۔ جی کے ہٹنے لگا۔

ایمیں نے ایم کے کی طرف دیکھا وہ ایک اوپھا لمبا دبلا پٹا نوجوان تھا اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ گویا شبت ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ابل رہی تھیں ”جو بھی آتا ہے اپنی بے عزتی کرتا ہے۔“ ایم کے نے قہقہہ لگایا۔

”تمہیں کیا خطرہ،“ جی کے نے اپنی ناگ کو گھوڑتے ہوئے کہا ”تمہاری بے عزتی کیسے ہو سکتی ہے کوئی عزت ہوتا ہے عزتی کا امکان ہوتا۔ لگا دیا اس سے کوئی بازی،“ جی کے نے ایمی اور زجاح سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اوہوں“ جاہ نے انکیاں ہلاتے ہوئے جواب دیا اپنے میں کاروگ نہیں۔ اس کھیل کے لیے وقت کہاں سے آئے قانونی طور پر جوانوں کو یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ابوڑھوں کا کھیل ہے۔ جب انسان کوئی کام نہ ہوتا۔

”اور تم کہاں کے جوان ہو؟“ ایم کے نے جاہ سے کہا
”یہ تو ٹھیک ہے،“ جاہ بولا ”جوان تو نہیں لیکن ابھی بوڑھا نہیں ہوا،“ تم خود کیوں نہیں کھیلتے اس کے ساتھ اس نے جی کے سے پوچھا
”اوہوں“ وہ بولا ”مجھ سے تو روز پڑتا ہے،“
ایم کے نے قہقہہ لگایا اور سر کھجانے لگا ”بات تو ٹھیک ہے۔“

تصویریں

جی کے اور ایم کے سے ملاقات کے بعد ایم کے مشانقل بڑھ گئے جاہ کی سر دھری سے اکتا کروہ سیدھائیوں ہاں چلا جاتا جہاں وہ دونوں رہتے تھے۔ یا تو ایمی جی کے کے ساتھ بیٹھ کر تصاویر کے لیے فریم بناتا رہتا اور یا ایم کے کے ساتھ شترنج کی بازی لگاتا۔ اسے ایم کے سے بے حد دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس میں زندگی جو ولہ تھا جاہ کی طرح اس کی زندگی اصولوں کا سہارا نہیں ڈھونڈتی تھی۔

اس کے بعد کئی ایک دن وہ سب تصاویر فریم کرنے میں شدت سے مصروف رہے فریم کی لکڑی کاٹنے اور اسے کیلوں سے جوڑنے کا کام جی کے کے سپر دھا۔

جی کے وزیر آباد کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو یہکنیکل کام کے لیے خصوصی صلاحیت رکھتا تھا۔

تصویر کی پیمائش کرنے کے بعد جی کے فریم کی لکڑی سانچے میں رکھ کر آرمی سے اسے کاٹتا اور پھر ان لکڑیوں کے نہرے جو زور ان میں کیل ٹھونک کر فریم تیار کرتا۔ جاہ اس دوران میں اس خصوصی تصویر اور تصویر کار کے متعلق معلومات بھم پہنچاتا اور تصویر کے خصوصی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا۔ ایلی مناسب سائز کے مطابق لگتے ایم کے ہتھوڑی اور کیل اٹھائے رکھتا تاکہ مناسب وقت پر جی کے کوبھم پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ سرکس کے مخزن کے طرح وہ اٹھی سیدھی حرکات لے لے اس کا دل بہلاتا رہتا۔

تصاویر فریم کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو خیال نہ آیا کہ ان میں بیشتر تصاویر برہنہ تھیں اور انہیں ہوشیل کے کمرے میں آویزاں کرنا قابل اعتراض سمجھا جا سکتا تھا۔ جاہ کے متعدد پیچھر سننے کے بعد ان سب کی توجہ اس حد تک تصاویر کے معانی پر مرکوز ہو چکی تھی کہ انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ بیشتر نقش ملبوسات سے معراتھے حتیٰ کہ بھا جب نماز پڑھنے کے بعد فریم بنانے کے کام کی رفتار کا جائزہ لینے کے لیے فریم شدہ تصاویر کی طرف دیکھاتا تو اسے بھی لا حول پڑھنے کا خیال نہ آتا۔

پھر جب انہوں نے اپنے اپنے کمرے میں وہ تصاویر آویزاں کر دیں اور ہوشیل کے لڑکوں نے انہیں دیکھا اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ شدت سے جسم کھجانے لگے تو ایلی نے محسوس کیا کہ وہ تصاویر برہنہ تھیں۔ اس نے جاہ سے بات کی ”جاہ تصاویر تو“ وہ رک گیا۔

”ہوں“ جاہ نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا
”میرا مطلب ہے“ ایلی گھبرا کر بولا ”یعنی“

”ہوں“ جاہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا

”یہ تصاویر تو برہنہ ہیں“ ایلی نے بعد مشکل جملہ مکمل کیا۔

” تصاویر ” اس نے کمرے میں لٹکی ہوئی تصاویر کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نگاہ میں تمخر جھلکا ” بہن ” اس نے حقارت بھری نگاہ ایلی پڑالی۔ جیسے اس کی نگاہ میں کمرے کی جملہ اشیاء میں سے صرف ایلی کا وجہ ریانی اور رہنگی کا مظہر ہو۔ تمخر اور نفرت کے اس اظہار پر ایلی وباں سے بھاگا۔ اے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ برآمدے ہیں بھاؤ ضوکر رہا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ بھاکے گلے لگ کرو پڑے۔ لیکن بھاپنی ہی دھن میں ملن تھا۔

” بھا ” وہ بولا یہ تصویریں جو ہم نے کروں میں آؤں اس کی ہیں ”

” ہاں ہاں ” بھاپوں دھونتے ہوئے بولا ”

” وہ عریاں ہیں میرا مطلب ہیں بھہنہ ہیں ”

بھاسوچ میں پڑ گیا ” ہاں ہاں ” وہ بولا ” مجھے بھی کئی بار شک سا پڑا ہے۔ ”

” وہ انہیں دیکھ کر کھجاتے ہیں ” ایلی بولا ” اور پھر کمرے سے باہر نکل کر چلتگاڑتے ہیں نعرے لگاتے ہیں اور ان کی آنکھیں ”

” ہاں ہاں ” بھا بولا ” مجھے خیال آتا ہے کہ ”

” اور وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں میاں میاں ”

میاں میاں سن کر بھا اچھل کر کھڑا ہو گیا ” ہاں ” وہ بولا ” میاں میاں مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ ”

” لیکن میاں میاں کا مطلب کیا ہے ” ایلی نے پوچھا

” میاں میاں کا مطلب ” بھانے تعجب سے ایلی کی طرف دیکھا۔

میاں میاں

میاں میاں درحقیقت کالج میں فارسی پڑھانے والے مولانا کا تکمیل کلام تھا۔ مولانا کا نام محمد عمر تھا۔ وہ کالج میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ کالج میں وہ اپنی چار ایک نمایاں خصوصیات کی وجہ سے مشہور تھے۔

ان کا حلق ایک ایسے وسیع ہال کی مانند تھا جہاں ہلکی سے ہلکی آواز گونج کر پھر گوئی تھی اس لیے ان کی معمولی سے معمولی بات بھی یوں سنائی دیتی تھی جیسے کوئی مجاہد حملہ کرنے سے پہلے سپاہیوں کو جوش اور غیرت والارہا ہو۔

مسلسل طور پر جوش اور جذبہ محسوس کرتی رہنے کی وجہ سے مولانا کے خدوخال نے ایسی ترتیب اختیار کر لی تھی کہ ان کا چہرہ احتجاج اور جذبہ کی امیزش بن کر رہ گیا تھا۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے جملہ نامناسب باتوں کے خلاف ایک گھونسہ کسایا ہو۔

مولانا کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ معمولی سے معمولی نامناسب بات پر وہ غصب میں آ جاتا اور اس شدت سے احتجاج کا اظہار کرتے کہ لڑکے محسوس کرتے کہ نہ جانے وہ کیا کر دیں گے۔ لیکن اس شدت بھرے احتجاج کے بعد وہ ہر نامناسب بات کو یوں برداشت کر لیتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے نامناسب باتوں کو برداشت کرنا ان کی عادت ہو۔ اور وہ اپنی اس عادت کی وجہ سے مجبور ہوں۔

مولانا کی آخری خصوصیت ان کا تکمیلی کلام تھا۔ وہ جماعت یا افراد سے میاں میاں کہہ کر مخاطب ہوتے۔ اسی وجہ سے لڑکوں میں وہ میاں میاں کے نام سے مشہور تھے۔ جماعت میں داخل ہوتے ہی وہ گوئی ”میاں میاں یہ کیا شور ہے“ اس پر لڑکے خاموش ہو جاتے۔ پھر کوئی مسخر اپنے سے سیٹی جاتا اور اس پر مولانا چونکتے ”لا حول ولا قوۃ“ سارا کالج مولانا کے اس مجاہد ان نعرے سے گوئیتا۔ پھر چاروں طرف سے پر اسرار آوازوں کی یورش شروع ہو جاتی ایک کونے میں چکی ہو گئی۔ دوسری طرف ریل گاڑی چھکا چھک کرتی اور تیسری طرف مینڈک ٹڑاتا۔ کوکل کوکتی۔ اور مولانا دفعتاً ان آوازوں کے وجود سے بے نیاز ہو کر صائب کے اشعار پڑھنے میں مصروف ہو جاتے۔

کریمنٹ ہوٹل کے اجراء کے بعد وقتی طور پر مولانا کو ہوٹل پر نہنڈنث بنا دیا

گیا تھا۔ وہ بورڈنگ کی میں بلڈنگ سے باہر ماحقہ عمارت کے ایک کمرے میں مقیم تھے جو کھانا کھانے کے کمرے کے قریب تھا۔

لڑکے ڈائننگ ہال کی طرف جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ بورڈنگ میں موجود ہیں چونکہ عام طور پر مولانا نماز پڑھتے ہوئے یا وضو کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ البتہ کوئی غیر مناسب بات وقوع میں آتی تو مولانا کا لاحول ولا قوہ ماحقہ بلڈنگ سے ابھر کر ہوشی کی میں بلڈنگ میں آ کر گوئختا اور لڑکے چونکہ کوئی اٹھ پڑھتے اور انہیں یہ امر یاد آتا کہ میاں میاں اس بورڈنگ کے پرنسپل ہیں اور ماحقہ بلڈنگ میں کوئی مناسب بات وقوع میں آئی ہے۔ اس پر میں بلڈنگ میں ایک سرگوشی ابھرتی ”میاں میاں“ اور ہر کمرے میں وہ رانی جاتی تھی کہ ساری بلڈنگ ”میاں میاں“ سے گوئی خجھ لگتی۔

مولانا دون میں صرف ایک بار میں بلڈنگ میں آتے تھے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ساڑھے نوبجے کے قریب وہ حاضری کا رجسٹر بغل میں دبا کر میں بلڈنگ میں داخل ہو جاتے۔ اور ہر کھلے کمرے میں جھانکتے اور بند کمرے پر دستک دے کر کہتے ”میاں میاں“ جس پر لڑکے ”لیں سر“ کہہ دیتے اور مولانا حاضری اگا کر دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتے۔

لاحول ولا قوہ

حاضری کے وقت کریمنٹ ہوشی میں خاصہ ہنگامہ رہتا تھا چونکہ کئی ایک حاضر لڑکوں کو کئی ایک غیر حاضر لڑکوں کی حاضریاں لگوانی ہوتیں تھیں۔ مثلاً کمرہ نمبر ایک کا لڑکا پہلے اپنی حاضری لگواتا پھر باری باری کمرہ نمبر 22, 14, 22 اور 52 میں داخل ہو کر یہ سر بول کر اپنے دوستوں کی حاضری لگواتا۔ لڑکا چاہے موجود ہو لیکن کمرہ ضرور اندر سے بند ہو۔ کمرے میں بتی جلانے رکھنا ضروری ہوتا۔ اور اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ باہر تالہ نہ پڑا ہو۔ جب مولانا سولہ نمبر پر دستک دیتے تو سولہ نمبر کا لڑکا اندر

سے لیں سر کھد دیتا اور جب وہ سترہ نمبر پر دستک دیتے تو رسول نمبر والا پھر سے لیں سر چلا کر سترہ نمبر والے کی حاضری لگوادیتا۔

ایک روز وہی ہوا جس کا ایلی کوڑ تھا جس وقت مولانا نے حاضری کے وقت جاہ کے دروازے پر دستک دے کر میاں میاں کہا اس وقت جاہ نہ جانے داستوں کی یا نامس میں کے مطابع میں اس حد تک مصروف تھا کہ میاں میاں کے جواب میں لیں سر کہنے کے بجائے بے خیالی میں اس نے کہا "کم آن"

دستور کے مطابق مولانا کو چاہئے تھا کہ آواز سن کر رجسٹر میں حاضری لگائیں اور انگے کمرے کی طرف چل پڑیں۔ چونکہ دستور کے مطابق اہم بات یہ تھی کہ اندر سے آواز آجائے۔ لیں سر کم آن یا گواہ سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے تھا لیکن جاہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہرے نہ جانے مولانا کو کیا ہوا۔ وہ یہ بھول گئے کہ وہ حاضری کے لئے راہنمہ کر رہے ہیں ممکن ہے جاہ کے انگریزی لب والجہ کو بھی اس سے تعلق ہوتا۔ بہر حال مولانا سمجھ بیٹھے کہ وہ پرنسپل کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ لہذا جاہ کے کم آن پر وہ انجانے میں پٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اس چھوٹے سے کیوبیکل میں ان اٹھائیں تصاویر کی طرف دیکھ کر مولانا لڑکھڑائے۔ ان کی آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ ایک ہی جست میں وہ باہر برآمدے میں پہنچے اور پھر ان کا احتجاج اور غم و غصہ حسب معمول اس مجاهد انہ نے عربے میں گونجا "لا حول ولا قوۃ"

یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں بلڈنگ میں مولانا نے لا ہول کی لکار لگائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس روز ہوشی کے کروں میں میزوں پر پڑے ہوئے گاس جل ترنسنگ کی طرح بیجے تھے۔ اور لڑکے گھبرا کر کروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اس وقت وہ میاں میاں کہنا یا تمثیخ سے چلانا بھول گئے تھے۔

باہر نکل کر لڑکوں نے دیکھا کہ مولانا ہوشی کے صدر دروازے کی طرف بھاگے جا

ہے ہیں اور حاضری کے رجسٹر کے ورق ہوٹل کے صحن میں اڑ رہے ہیں۔ مولانا حاضری لگانا بھول گئے تھے۔ اور انہیں حاضری کے رجسٹر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اس روز کریمینٹ ہوٹل کے جملہ لاکوں میں سے صرف جاہ واحد لاک کا تھا جو اس حادثے سے بے خبر اپنے کمرے میں بیٹھا کر اب پڑھنے میں منہمک رہا تھا۔

اگلے روز نیوٹن ہال میں بیٹھے ہوئے جب بھا اور ایلی آن شترات کے واقعہ پر تبصرہ کر رہے تھے تو جاہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اچھا میں نے خیال نہیں کیا،“ وہ انگلیوں سے کھلتے ہوئے کہہ رہا تھا ایم کے نے قہقہہ لکایا ”اچھا ہوا“ وہ بولا اپنی بھی روز بے عزتی ہے۔“

”تم چپ رہو بھی“ میں گئے نے اپنے ڈانٹا ہاتھ پر دیکھ دیا۔“
”اچھا بھی“ وہ بولا تو کوئی اور بولے اب

بھانے کہا ”لیکن اب ہو گا کیا“

”اللہ جانے کیا ہو گا“ ایلی نے کہا

وہ سب خاموش ہو گئے

دیر تک خاموشی چھائی رہی

پھر دھتا ”جاہ بڑا نے لگا“ نہیں نہیں نہیں نہیں

سب کی نگاہیں جاہ پر مرکوز ہو گئیں

جاہ انگلیوں ہی انگلیوں سے کھلتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ وقتاً اس نے اوپر دیکھا اور کہنے لگا ”کیا ہم ایسی جگہ نہیں رہ سکتے جہاں مائیکل اشکلوبرنے جو زناور لارڈ لشن پر لا حول نہ پڑھی جائے ضرور رہ سکتے ہیں بالکل“ وہ قطعی فیصلے کے انداز میں بولا جاہ کے اس قطعی فیصلے کے بعد سب نے مل کر ایک پرائیویٹ لاج میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔